جنٹل مین۔ الحمدللہ

میجر اشفاق حسین

جنٹل مین الحمدللہ

میجر اشفاق حسین

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ادارہ مطبوعات سلیمانی
رحمان مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ
اردو بازار۔ لاہور ۲

ناشر ——— عبدالوحید سُلیمانی

طابع ——— منہاج الدین اصلاحی

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس
۴۳۔ نسبت روڈ، لاہور

طبع اوّل ——— مارچ ۱۹۸۴ء ۱،۰۰۰

طبع دوم ——— جون ۱۹۸۵ء ۱،۰۰۰

طبع سوم ——— جنوری ۱۹۸۷ء ۱،۰۰۰

طبع چہارم ——— اکتوبر ۱۹۸۸ء ۱،۰۰۰

طبع پنجم ——— دسمبر ۱۹۹۰ء ۱،۰۰۰

قیمت ——— -/۴۵ روپے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اس کے نام

ہے میرے گرد جس کی دُعاؤں کا دائرہ
جو میری عافیت کی مُبارک لکیر ہے

مفتاح

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	جنٹل مین! الحمد للہ!	۷
۱	پہلے پہل کے تجربے،	۱۱
۲	تحریر و پیش کش ـــــ مدیرِ ہلال	۳۵
۳	بحوالۂ صحافت،	۴۷
۴	بلندیوں کی جانب :	
	ا۔ لاجواب پرواز	۶۷
	ب۔ دیومالائی گلگت	۷۶
	ج۔ فرمائشوں کے رنگ	۸۵
	د۔ تنہائیوں کے دُکھ	۹۱
	ہ۔ رنگ رلیاں	۱۰۲
	و۔ اِمتحان در اُمورِ خانہ داری	۱۲۷
۵	بدحواسیاں	۱۴۶
۶	جھروکۂ مارشل لا سے	۱۶۲
۷	نشیب و فراز	۲۰۰
۸	یونیورسٹی لائف کا دُوسرا جنم	۲۱۳

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

جنٹلمین! الحمدللہ

جنٹلمین بسم اللہ کے دُوسرے ایڈیشن کی اشاعت پر ہم نے گرد پوش پر اپنے ایک دوست کی یہ رائے نقل کی تھی "روزانہ بُک سٹال پر جا کر چند صفحے پڑھتا ہُوں، اچھی ہے، پر اتنی بھی نہیں کہ پلّے سے پُورے اکیس روپے خرچ کر کے خریدی جاتے۔"

اِس میں اشارہ تھا عقلمندوں کے لیے لیکن کتابوں کی دُنیا میں سب سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں بُک سیلر یا کرائے پر کتابیں دینے والے لائبریرین۔ کتاب کا دُوسرا ایڈیشن شائع ہُوا تو ہم نے کئی جگہوں پر ان ہدایات کی تختیاں آویزاں دیکھیں: "براہِ مہربانی یہاں اخبار یا کتاب نہ پڑھیں۔"

"اچھے آدمی کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

الحمدللہ! کہ ہمارے مُلک میں اَدبی کتابیں خریدنے کا رُجحان باقی ہے وگرنہ بعید نہ تھا کہ جنٹلمین بسم اللہ کے تجربے کے بعد ہمارے ناشر عبدالوحید سُلیمانی اِس کتاب کے ٹائیٹل پر سیاہ حاشیہ لگواتے اور عُنوان رکھتے: جنٹلمین! اِنّا لِلّٰہ یا استغفراللہ۔ انجام کار برعکس پایا گیا اور سُلیمانی صاحب نہ صرف دیوالیہ ہونے سے بچ گئے بلکہ جنٹلمین الحمدللہ چھاپنے کی جرأت بھی کر رہے ہیں۔ اُمید ہے انھیں اِس کتاب کے خریدار بھی میسّر آئیں گے اور یقیناً خریدی جانے والی کتابیں پڑھنے والوں کے ہاتھ بھی لگیں گی۔ اور ہمیں بھلے قارئین کی مثبت آراء سے مستفید ہونے کا موقع مِل سکے گا۔

الحمدللہ کہ صحافی برادری میں ہماری پہلی کتاب کا اِستقبال بڑی خندہ پیشانی سے کیا گیا۔ ہم ان تمام خواتین و حضرات کے مشکور ہیں جنھوں نے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی اور مفید مشوروں سے نوازا اور کتاب کو اپنے قارئین سے متعارف کروایا۔ اِس سلسلے میں اخبارِ خواتین کی مدیرہ محترمہ شمیم اختر کا ذِکر بے جا نہ ہوگا۔ انھیں برائے تبصرہ کتاب بھیجنے لگے تو ایک لمحے کو ٹھٹک گئے کہ ہماری کتاب کے ٹائیٹل کا لہجہ خالص مردانہ تھا۔ جنٹلمین کو خطاب کرتے ہوئے بسم اللہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ خواتین کا ذِکر نہ تھا۔ آزادیِ نسواں کے اس دَور میں اس "امتیازی" برتاؤ پر خواتین کی طرف سے بائیکاٹ کی دھمکی بھی مِل سکتی تھی لیکن پھر حوصلہ ہُوا کہ خُود اخبارِ خواتین خالص زنانہ قسم کا پرچہ ہے جس کی مدیرہ بڑی شانِ

سکندی سے اس کی پیشانی پر لکھتی رہی ہیں " خواتین کا اخبار جسے مرد بھی پڑھ سکتے ہیں " سو ہم نے لکھا : " مردوں کی کتاب جسے خواتین بھی پڑھ سکتی ہیں ۔"

اَلحمد للہ کہ انھوں نے نہ صرف اسے پڑھا بلکہ خوبصورت لفظوں میں ایک پیارا سا تبصرہ اپنی ڈائری میں لکھا   شکریہ ! خانم ۔

لگے ہاتھوں ہم ایک سوال کا جواب بھی دینا چاہیں گے کہ جب سے مصنف ہوتے ہیں ۔ بڑے تواتر سے پوچھا جا رہا ہے " کتنا فائدہ ہوا آپ کو اس کتاب سے ؟"

خواتین و حضرات ! آج ہم اِس تکلیف دہ سوال کا مفصّل جواب دے رہے ہیں ۔ خدارا آئندہ ایسے اِنکم ٹیکس کے افسروں والے سوالات سے معاف رکھیے گا ۔

ہمیں پہلی کتاب کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت سے مبلغ ایک سو اسی روپے کی آمدنی ہوئی اور تفصیل اس کی یوں ہے کہ ' جنٹلمین بسم اللہ ' کی اشاعت کے کافی دِنوں بعد جب ہم سلیمانی صاحب سے حساب کتاب کرنے پہنچے تو ایک طویل فہرست انھوں نے ہمارے سامنے رکھ دی ۔ یہ اُن نسخوں کی فہرست تھی جو وہ ہمارے کہنے پر مختلف افراد کو روانہ کرتے رہے تھے اور یہ وہ حضرات تھے جنھیں ہمارے حلقۂ رفاقت میں ہونے کا دعویٰ تھا اور اس ناطے سے وہ مدعی تھے کہ کتاب اپنے دستخطوں سے انھیں پیش کریں ۔ اِن کتابوں کی قیمت منہا کرنے کے بعد ہماری رائلٹی میں مبلغ ایک سو اسی روپے نصف جن کے مبلغ اسی نوّے روپے بنتے ہیں ' بچتے تھے ۔ ہم نے ان کی وصولی کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھی ۔

یہ رقم ہمیں ملی تو سہی لیکن خبر کی شکل میں ۔ چھوٹا بھائی ملتان میں میڈیکل کالج کا طالب علم ہے ۔ اس کے کالج اور ہاسٹل کی فیسیں ہمیشہ واجب الادا رہتی ہیں ۔ اسے خبر ہو گئی کہ بھائی جان نے کسی سے پیسے لینے بھی ہیں ۔ یہ مواقع روز روز نہیں آیا کرتے ۔ آناً فاناً سلیمانی صاحب کے پاس پہنچا اور لے اُڑا ۔ ہمیں خط لکھ دِیا کہ پیسے وصول پائے ۔ مطمئن رہیے گا ۔

ہم مطمئن ہو رہے ۔

یہ کاپی پریس بھیج رہے تھے کہ ہمارے کپتان سے میجر ہونے کے احکامات کی خبر ملی ۔ جب تک کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گی ۔ نیا رینک ہمارے شانوں پر ہو گا ۔ الحمد للہ

اشفاق حسین

۶ر جون ۱۹۸۳ء

ساڑھے دس بجے شب

مِلٹری کالج جہلم

حال مقیم ۔ خمیس مشیط

سعودی عرب

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

باسمہ سبحانہ

کچھ رواج سا ہو چلا ہے ' وطن کی باتیں دیارِ غیر میں بیٹھ کر کرنے کا ۔ جانے والا کہتا یہی ہے کہ آنکھیں ٹسٹ کروانے چلا ہوں ' کسی ہارٹ سپیشلسٹ سے ملنا مطلوب ہے ' میڈیکل چیک اپ کروانا ہے وغیرہ وغیرہ ۔ ہم نے جب اڑتی اڑتی خبریں سنیں کہ ہمیں باہر بھیجا جا رہا ہے تو یکایک بصارت کمزور پڑتی دکھائی دی ' پھر دل کی دھڑکنیں منتشر منتشر سی لگیں گویا باہر جانے کی مطلوبہ نشانیاں پوری تھیں لیکن وہاں نہیں جہاں دامنِ یزداں چاک نظر آتا ہے اور جہاں پہنچ کر عروسِ وطن کے چہرے پر داغ دھبے ' کیل مہاسے اور چھائیاں نظر آنے لگتی ہیں بلکہ وہاں جہاں اپنا گریباں چاک والے معاملات پیش آتے ہیں وہیں بیٹھ کر ہم نے جنٹلمین الحمد للہ ' مکمل کی اور مسودہ سلیمانی صاحب کو بھجوا دیا ۔

کتاب شائع تو ہو گئی لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر اہلِ وطن کا ردِ عمل کیا رہا ۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً وہ فاصلے تھے جو ہمارے اور قارئین کے درمیان حائل تھے) ' دوسری وجہ ڈاک کی ان ٹکٹوں کی گرانی جو ان فاصلوں کو پاٹ سکتی تھیں ۔ ایک تیسری وجہ سلیمانی صاحب سے معلوم ہوئی ۔ انہیں خط لکھ کر پوچھا کہ کیسی جا رہی ہے کتاب ؟ جواب آیا :

" چپ ! ملک میں ریفرنڈم ہو رہا ہے "

ہم چپکے ہو رہے ۔ ریفرنڈم کے بعد خط لکھا تو جواب آیا :

" شی ! انتخابات ہونے والے ہیں " ۔

انتخابات کے بعد ہم خود ہی چلے آئے ۔ پتہ چلا کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا حالانکہ سلیمانی صاحب کے خطوں سے تاثر یہی ملتا تھا کہ پوری قوم پولنگ سٹیشنوں کے

باہر سا کن وصامت ہے اور دوونر بلیٹ پیپر اٹھائے سلوموشن میں بیلٹ بکسوں کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اگر کسی نے اور بات کی تو گویا انتخابات کا عمل بیچ ہی میں رہ جائے گا۔

سلیمانی صاحب سے تبادلہ خیالات کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ اصل میں پیشہ ورانہ حسد ان پر غالب آگیا تھا۔ انہوں نے چھاپی تھی جنٹلمین الحمد للہ ' اور حکومت چھاپ رہی تھی بیلٹ پیپر ---- سلیمانی صاحب ٹہرے کاروباری آدمی۔ وہ نہایت باریکیوں سے دیکھ رہے تھے کہ کون سی چیز زیادہ بکتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کس نتیجے پر پہنچے لیکن بغیر کسی پبلسٹی اور تبصرے کے ' جنٹلمین الحمد للہ کے پہلے ایڈیشن کا بلا چون و چرا بک جانا اس بات کی علامت ہے کہ
----- کتاب اچھی ہو تو اسے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے بہت سے ہاتھ اس کتاب کو تھامنے کی سعادت سے محروم رہ گئے ہوں گے اس لئے پیش خدمت ہے ایک اور ایڈیشن۔

میجر اشفاق حسین
سکول آف آرمی ایجوکیشن
اپر ٹوپہ ---- کوہسار مری

پہلے پہل کے تجربے

پی ایم اے کی بھٹی میں تپ کر ہم کندن ہوئے تو جی ایچ کیو کے حکم سے ہمارے شانوں پر اِک تارہ اُترا، صبح کے ستارے کی طرح ؎

سرمایۂ شب ہوتے ہیں یوں تو سبھی تارے
ہر تارہ مگر صبح کا تارا نہیں ہوتا

اس کی چمک دمک، سج دھج اور جگمگاہٹوں کا عالم کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ ہماری پہلی تعیناتی بنوں کے ایک برگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ہوئی تھی۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ہمارے اکلوتے ستارے کی ضیا بار کرنوں سے بہت سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ وہ قریب سے گزرتے تو جھپاک سے سلیوٹ کرتے، بات کرنے آتے تو کھٹاک سے اٹن شن ہو جاتے اور اس وقت تک اسی حالت میں رہتے جب تک ہم انھیں آساں باش کا اذن نہ دے دیتے۔ کچھ لوگ جن میں بالا افسران شامل تھے، ہماری افسرانہ شان پر مسکراتے بھی تھے لیکن تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شروع شروع میں بڑے لوگوں پر ہنسنا ہمیشہ سے معمول کی بات رہی ہے سو ہم ان طنز آمیز مسکراہٹوں کو اِک شانِ بے نیازی سے نظر انداز کرتے رہے۔

پی ایم اے چھوڑنے سے پہلے ہی ہمیں بنوں تعیناتی کی خبر سنا دی گئی تھی۔ پاسنگ آؤٹ پریڈ کی خبریں اخباروں میں چھپیں تو ان میں اس بات کا کہیں ذکر نہ تھا کہ کون سیکنڈ لیفٹیننٹ کہاں اور کس یونٹ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمانے چلا ہے۔ کسی سے پوچھا تو بتایا گیا کہ سکیورٹی کی خاطر بڑے لوگوں کی موومنٹ کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھار ان

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کے سفر کرنے کی تاریخیں، آنے جانے کے رُوٹ اور اوقات عین وقت پر بدل بھی دیے جاتے ہیں، بات معقول تھی، ہم نے مان لی۔ اس کے بعد دو چار دنوں کی تعطیلات کے دوران میں ہم جی ایچ کیو کی طرف سے نئے احکامات کے منتظر رہے کہ شاید سفر کی تاریخوں میں توسیع کر دی جائے یا کسی اور شہر جانا قرار پائے لیکن غالباً سکیورٹی کے انتظامات مکمل تھے، کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

بنوں پہنچے۔ یہاں ہمارے آنے کی خبریں پہنچ چکی تھیں۔ ہیڈ کوارٹر کے قریب کی ایک عمارت میں ایک کمرہ ہمارے نام الاٹ ہو چکا تھا۔ جسے نہلا دھلا کر چمکا دیا گیا تھا۔ ایک عدد اَردلی پہلے سے ہمارا منتظر تھا جس نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آناً فاناً اٹیچی کیس اور بستر بند کھولا اور جب تک ہم نہا دھو کر فارغ ہوتے اس نے بستر لگا دیا تھا، کپڑے وارڈروب میں لٹکا دیے تھے، جوتے شو ریک SHOE RACK پر لٹکا دیے تھے۔ اور باقی ساری چیزیں بھی قرینے سے لگا دی تھیں۔ خود مؤدب سرنگوں کھڑا ہمارے نئے احکامات کا منتظر تھا۔ یہ تھا ہمارا پہلا اَردلی سَیدُ اللہ خان۔ ہم نے اسے بہتیرا سمجھایا کہ تمھارا نام یا تو سعید ہونا چاہیے یا سَیّدُ اللہ خان لیکن اس کا اصرار تھا "نہیں جی۔ گھر والے ہمیشہ سے سَید (بروزن قید) ہی کہتے آئے ہیں آپ بھی اسی نام سے پکاریں۔" ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

نئی افسری کا نشہ دو آتشہ کرنے میں سیداللہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ پرانا فوجی تھا، مطیع و فرمانبردار، اشاروں پر کام کرتا، یوں لگتا تھا جیسے ٹیلی پیتھی کا ماہر ہو۔ ادھر ہمارے ذہن میں سوچ کی کوئی لہر اُبھری، ادھر اس کے دماغ کا کوئی بٹن آن ہُوا اور وہ خود بخود کام میں جُت گیا۔ گھنٹوں اس کے اور ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوتی لیکن کام تھے کہ خود بخود سنورتے چلے جاتے۔

سردیوں کے دن تھے۔ صبح سویرے وہ شیو کا گرم پانی لیے دبے پاؤں کمرے میں آتا۔ ایک تپائی پر شیو کا سامان سجاتا اور تولیہ لیے بڑے مؤدب انداز میں ہمیں بیدار کرتا .. اُٹھتے، ٹانگیں لٹکا کر بستر پر بیٹھتے، آنکھیں مل رہے ہوتے، وہ سر جھکا کر تولیہ ہماری گود

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

میں پھیلا کر تپائی آگے سرکا دیتا۔ پھر روشنی جلا کر خود باتھ روم چلا جاتا۔ جب تک ہم شیو سے فارغ ہوتے وہ باتھ روم کا جائزہ لے چکا ہوتا۔ غسل کے لیے گرم پانی، صابن، تولیہ، ڈیٹول، بالٹی، مگا، ہر چیز صاف ستھری اپنی جگہ پر ہوتی۔ صابن ختم ہونے کو ہوتا، وہ خود ہی نئی ٹکیہ لا کر رکھ دیتا۔ ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب چھوٹی ہوتے ہوتے خود بخود بڑی ہو جاتی، شیونگ کریم تھوڑی رہ جاتی تو نئی ٹیوب پہلے سے موجود ہوتی۔ اِس کے لیے ہمیں کبھی سیداللہ کو کہنا نہیں پڑا۔ شیو سے فارغ ہو کر باتھ روم جاتے۔ واپسی پر دیکھتے۔ بستر تہ ہوا رکھا ہے، جائے نماز بچھی ہے۔ ہم نماز کو کھڑے ہوتے، سلام پھیرتے تو بستر پر وَردی الگ الگ پڑی ہوتی۔ خان بھتر موس لے کر میس جا چکا ہوتا۔ جب تک ہم نماز پڑھ کر وَردی پہنتے وہ میس سے واپس آ چکا ہوتا۔ یہ بات بھی ہم دونوں کے درمیان خاموش معاہدے کے طور پر طے پا گئی تھی کہ جب تک ہم وَردی نہ بدل لیں، وہ باہر ہی ٹھہرے گا۔ جوتوں کی کھٹ پٹ سُنتا تو سمجھ جاتا کہ وَردی پہن لی گئی، تب وہ دستک دے کر اندر آتا، ناشتہ میز پر جماتا اور خُود پھر باہر چلا جاتا۔ ناشتہ کر کے ہاتھ دھونے باتھ رُوم کی طرف بڑھتے۔ واپس آتے تو وہ ٹوپی اور سٹِک لیے کھڑا ہوتا، ہم دونوں چیزیں تھامتے، وہ دروازہ کھول کر کھڑا ہو جاتا۔ دروازے سے گزرتے تو کہتا، "اللہ حافظ سر! فی امان اللہ!" ہم ہوں کے اشارے سے جواب دیتے دفتر کی طرف بڑھ جاتے جو قریب ہی واقع تھا۔ یوں مُنہ اندھیرے اُٹھ کر دفتر جانے تک تمام کام خود بخود انجام پاتے۔

باقی دن بھی اسی طرح گزرتا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ سیداللہ کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش آئے۔ کہیں جانا ہے۔ لباس بدلنے کے لیے ہم نے وارڈروب کی طرف ہاتھ بڑھایا، ہینگر سے کوئی قمیص اتاری۔ پھر چھوڑ دی، کوئی اور پہن لی۔ سیداللہ پریشان ہو جائے گا قمیص چھوڑی کیوں گئی۔ ہمارے جانے کے بعد وہ اس کے کالر، کف، دامن، بٹن سب کچھ تفصیلاً چیک کرے گا۔ کہیں میل کا شائبہ ہوا تو قمیص دھوئے گا، سکھا کر دھوبی سے استری کروائے گا اور وارڈروب میں سجا دے گا۔ کوئی بٹن ٹوٹا ہوا

ہے، بدل دے گا، کوئی دھاگا کہیں سے سر نکال رہا ہو، کاٹ دے گا۔ اِستری کی کریز بگڑی ہوئی ہے، کروالائے گا۔ غرض ہم دوبارہ وارڈروب کی طرف ہاتھ بڑھائیں تو ممکن ہی نہیں کہ چھوڑی گئی قمیص میں نئی آب و تاب نہ آگئی ہو۔ اور یہ ساری چمک دمک اسے سیداللہ نے عطا کی ہوتی۔ اس کی غیر موجودگی میں ہم کسی قمیص، پتلون یا نیکر وغیرہ میں کوئی خرابی دیکھتے تو وارڈروب سے نکال کر کرسی پر ڈال دیتے۔ یہ اشارہ سیداللہ کے لیے کافی ہوتا یہ سمجھنے کے لیے کہ اس میں کوئی خرابی ہے۔

ہم نے شُو ریک SHOE RACK سے کوئی جوتا اُٹھایا، پھر اسے فرش پر ہی چھوڑ دیا، کچھ اور پہن گئے۔ اس جوتے کی شامت آئی۔ سیداللہ بھنویں سکیڑ کر پہلے اس کا سرسری جائزہ لے گا، پھر تفصیلی مطالعہ کرے گا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھے گا، سول SOLE سلامت ہے، اندر کی طرف کوئی میخ تو نہیں اُبھری ہوئی، پتا دے تو تنگ نہیں کر رہے۔ اور کچھ نہیں تو اسے جوتے کی چمک پر شبہ پڑے گا۔ تب وہ گھنٹوں بیٹھا اسے چمکاتا رہتا۔

سیداللہ کا کمال یہ تھا کہ اس ساری کارکردگی کے باوجود کم گو تھا، چپ رہتا تھا۔ ہماری گفتگو ہوں ہاں یا سر کے خفیف اِشاروں سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

یہ ساری باتیں اتنی تفصیل سے یوں یاد ہیں کہ باوجود کوشش کے ہم سیداللہ ثانی تلاش نہیں کر پاتے۔ اس کے بعد بھانت بھانت کے اُردلیوں سے پالا پڑا۔ ایک سیداللہ کی خوبیاں بہت سے اردلیوں میں بکھری ہوئی ملیں، کسی ایک میں جمع نہ ہو پائیں۔

کسی اور شہر کی بات ہے۔ ایک اردلی ملا۔ جھنگ سرگودھا کے کسی دُور دراز علاقے کا رہنے والا تھا۔ اُردو بولنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ ٹھیٹھ پنجابی کے لہجے میں اسے ہماری بات سمجھ آتی نہ ہم اس کی کچھ سمجھ پاتے۔ کیا سُن گیا، کیا کہہ گیا۔ "یس سر" اس کا تکیہ کلام تھا۔ ہم نے کسی کام کو کہا۔ "یس سر!" کہہ کر کمرے سے باہر چلا جائے گا۔ وہاں کھڑا سوچتا رہے گا۔ کہ ہم نے کیا کہا۔ دوبارہ پوچھنا غالباً سوءِ ادب خیال کرتا تھا۔

ایک شام ہم مطالعے کی میز پر کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ اسے وارڈروب سے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

شلوار قمیص نکال کر ازاربند ڈالنے کو کہا۔ "یس سر" کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ہم میز سے اُٹھے، کمرے میں نظر دوڑائی، شلوار قمیص کا کہیں پتہ نہ تھا۔

چلّائے۔ "بُوٹے۔"

"یس سر" کہہ کر وہ حاضر ہو گیا۔

"تمھیں کچھ کام کہا تھا؟"

"یس سر!"

"ہو گیا ___؟"

"یس سر!"

"تو کہاں ہیں کپڑے؟"

"کیہڑے کپڑے جی؟" (کون سے کپڑے جی؟)

ہم سر تھام کے رہ جاتے۔

میس کے باہر بڑا وسیع سرسبز لان تھا۔ دیواروں پر زرد چنبیلی کی بیلیں تھیں۔ کیاریوں میں سُرخ گلاب کے کھلتے ہوئے پھول، کونوں سے رات کی رانی مہکتی جس کے قریب ہی چمپا کی کلیاں مسکراتی رہتیں۔ ایک مہک تھی جو ہر سُو چھائی رہتی۔ شام ڈھلے لان میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ کہیں کہیں ہلکی ہلکی روشنی والے لیمپ پڑے ہوتے جن پر جھالروں والے شیڈ ہوتے۔ ایک رات ہم ایک لیمپ کے ساتھ بیٹھے کوئی خوبصورت کتاب پڑھ رہے تھے۔ ایک شعر پڑھا ؎

جگنوؤں کے چمکتے ہوئے سے دیئے
جیسے بیوہ ہو آنچل میں افشاں لیے

ہم نے نظر اُٹھائی تو پھولوں کی کیاریوں میں جگنو دمک رہے تھے۔ جگنوؤں کی یہ جلتی بجھتی روشنیاں ہمیں کئی سال پیچھے لے گئیں۔

لاہور میں آپ کبھی شاہراہِ قائدِ اعظم پر سے پیدل گزریں تو اس کا حُسن آپ پر نمایاں ہو۔ ویسے تو ہوائی اڈے تک اس کے دونوں جانب خوبصورت درختوں کے

سایے ہیں۔ دیودار، صنوبر، شیشم اور سفیدے کے قدآور درخت، لیکن عجائب گھر اور پنجاب یونیورسٹی کے سامنے مولسری کے چھوٹے چھوٹے درختوں کی بہتات ہے۔ گرمیوں کی شاموں میں ان کی بھینی بھینی خوشبو سے مہکی رہتی ہیں۔ پیدل چلنے والوں پر ان کی برسات ہوتی رہتی ہے۔ تھوڑا آگے آئیں تو میونسپل کمیٹی کا دفتر ہے۔ آج کل شاہراہِ قائداعظم عین اس کے سامنے سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے یہ سڑک یہاں نہیں تھی۔ سب کچھ ایک وسیع سبزہ زار تھا جس کے گرداگرد گولائی میں، لکڑی کی جالیاں لگی ہوتی تھیں۔ اسی مناسبت سے یہ گول باغ کہلاتا۔ آم کے گھنے درخت، سرمئی شام کی تاریکیاں اُترتیں تو ان کے سایے گھنے اندھیروں میں بدل جاتے۔ عمارت سے چھن چھن کر آتی مدھم روشنیوں میں فوارے کا پانی، پھوار بن کر برستا، کیاریوں میں پھول مہکتے اور نرم نرم شبنمی گھاس پر ننگے پیروں چلنا اچھا لگتا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب چاند کی چاندنی چاروں طرف پھیلتی تو یہاں بھی نور اترا کرتا۔ بچپن کے دن تھے، بے فکری کی راتیں، ہم اکثر یہاں آنکھ مچولی کھیلا کرتے۔ میں نہیں کھیلتی تھی۔ لڑکوں لڑکیوں میں من و تو کی تمیز نہیں تھی۔ اب ایسا لگتا ہے جیسے چاند کی کرنوں سے پریاں اترا کرتی تھیں معصوم، شوخ، شرارتی پریاں ——— ایک دفعہ دیکھا۔ ہم میں ایک بڑی پری اتر آئی ہے، براق ایسے کپڑوں میں ملبوس، سفید صندلی بانہیں، جگمگاتا چہرہ جن پر بکھری پریشان لٹیں، چاندنی میں کھلتا کندن سا بدن ——— ایک اجنبی اور بڑی پری کو اپنے درمیان پاکر آنکھ مچولی رُک گئی۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹیں لیے سب کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے۔ تجسس کے سکوت کو خود انھوں نے توڑا۔ ہمارے ساتھ والی گلی میں نئی نئی آئی تھیں۔ گرمیوں کی راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ شروع رات میں نیند نہیں آتی۔ گھر میں دم گھٹتا ہے۔ سیر کے لیے گول باغ چلی آئیں۔

"ہمیں کھلاؤ گے ——— ؟"

ہم سب ہنس دیے۔ بھلا اتنے بڑے بڑے لوگ کہیں بچوں میں کھیلا کرتے ہیں؟ لیکن انھوں نے خود ہی اپنے لیے کام ڈھونڈ نکالا۔ وہ "دائی" بن گئیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

آنکھ مچولی میں 'چور' سے بچ کر جسے ہاتھ لگایا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ہم میں گھل مِل گئیں۔ ہمیشہ سفید کپڑوں میں نظر آتیں۔ ہم نے ان کا نام "چاند پری" رکھ چھوڑا۔

گرمیاں گزر گئیں۔ سکول کھل گئے۔ گول باغ جانا موقوف ٹھہرا۔ گلابی جاڑوں کی آمد آمد ہوئی۔ ایک رات ہم ٹہلتے ٹہلتے گول باغ نکل گئے۔ دیکھا درختوں کے اندھیروں میں ایک سفید سایہ سا لہراتا ہے۔ تجسس نے قریب کیا تو دیکھا وہی ہیں۔ "چاند پری" حیران ہوتے پوچھا۔

"اکیلی کیا کر رہی ہیں یہاں آپ؟"

"تم لوگ جو نہیں آتے۔ اکیلے نہ آئیں تو کیا کریں؟"

"لیکن آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ گرمیوں میں تو مزہ آتا ہے یہاں۔ اب تو سردی ہو چلی ہے ——— ارے آپ نے اتنے باریک کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔ ٹھنڈ نہیں لگتی آپ کو۔" ہم نے ان کے دمکتے بازو تھامتے ہوئے کہا۔

"جب زندگی آگ بن جائے تو سرما کی رُت کچھ نہیں کہتی اور جلاتی رہتی ہے۔"

بات گرچہ پلّے نہیں پڑی تھی لیکن فقرہ خوبصورت لگا تھا۔ بعد میں ہم نے اسے کاپی پر لکھوا چھوڑا تھا۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے آ جایا کرو نا روزانہ!" انھوں نے درخواست کی۔

"لیکن اب سکول کھل گئے ہیں۔ ڈھیر سارا کام کرنا ہوتا ہے۔ شام کو وقت ہی کہاں ہوتا ہے؟"

ہم نے مجبوری ظاہر کی۔ وہ چپ ہو گئیں۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

"آپ نے آنا ہی ٹھہرا تو کسی کو گھر سے ساتھ لے آیا کریں ——— آپ کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک؟ دولھا بھائی کو لایا کریں نا ساتھ اپنے۔"

ہم نے ایک اور حل پیش کیا۔ اور ان کی آنکھوں میں ستارے جھلملا اٹھے۔ چاند کی چاندنی میں پلکوں پہ لرزتے آنسو۔ دُور کہیں سے کوئی گاڑی گزری۔ اس کی اچٹتی ہوئی روشنی ان آنسوؤں پر پڑی۔ تو ہم نے ان میں کئی رنگ مچلتے دیکھے۔ بولیں۔

"میں بیوہ ہوں۔" دُور آسمان کی وسعتوں میں اِک تارا ٹوٹا۔

"بیوہ ـــــ ؟" ہمارے لیے یہ نیا لفظ تھا۔ بیوی تو سُنا تھا۔ یہ بیوہ کیا ہُوا۔ انھوں نے مفہوم سمجھایا تو دل کٹ کے رہ گیا۔ پھر جو انھوں نے بتایا کہ کس طرح ان کا گھران کے لیے جہنم بنا ہوا ہے۔ ہر کوئی طنز کے تیر برساتا ہے۔ طعنوں کے نشتر چبھوتا ہے۔ یہاں تک کہ ماں بھی کبھی کبھی ان کے مرجانے کی دُعا کرتی ہے۔ جوانی عذاب بن گئی ہے۔ دِن تو کسی نہ کسی طرح گزر جاتا ہے، رات کی تنہائیاں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ وقت گزاری کے لیے وہ گول باغ چلی آتی ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم تھا وہ اتنی دکھی ہیں۔ وعدہ کیا کہ ان کا ساتھ دینے کو روزانہ آیا کریں گے۔ ان کی آنکھوں میں پھر آنسو جھلملا اٹھے۔ ہم نے ان کے ہاتھ سے رومال لے کر بڑے خلوص سے ان کے آنسو پونچھ ڈالے۔ کئی دنوں تک ہم نے وعدہ نبھایا۔ ہماری گفتگو کا سارا محور ہمارا اسکول تھا۔ کتابیں، کتابوں کی کہانیاں، ہمجولی، دوست، دوستوں کی شرارتیں۔ وہ ہمیں پریوں کی کہانیاں سنایا کرتیں۔ باتیں کرتے کرتے تھک جاتے تو جگنو پکڑنے کی باری آتی۔ ہم جگنو پکڑ پکڑ ان کے سفید دوپٹے میں جمع کیا کرتے۔

"سر! پھٹ ٹیک دوں ؟" اچانک ہمارے دائیں طرف ایک دھماکہ ہُوا۔ ہم ہڑبڑا کر چونک اٹھے۔ دیکھا بوٹا کھڑا دانت نکوس رہا تھا۔ ہم نے اسے بتایا تھا کہ شام کو باربر کو کمرے میں لے آئے، بال کٹوائیں گے۔ وہ بولا:

"سر! میں لوڑے ویلے سے آپ کو کمرے میں اُڈیک رہا ہوں اور آپ یہاں بیٹھے جگنوؤں کو تکی جا رہے ہیں۔ آپ حکم کریں میں بہت سارے پھٹ ٹیک کے کمرے میں لے آتا ہوں۔"

("سر! میں شام سے کمرے میں آپ کا اِنتظار کر رہا ہوں اور آپ یہاں بیٹھے جگنوؤں کو دیکھے جا رہے ہیں۔ آپ حکم کریں میں بہت سارے پکڑ کے کمرے میں لے آتا ہوں۔")

ایک اور ملا ـــــ عقیل۔ یعنی عقل میں بہت ہی زیادہ بڑھا ہُوا۔ "سگھڑ پن"

کی انتہاؤں کا نام "عقیل" تھا۔ ہر کاغذ اور کپڑے کو تہ کرنا اور پھر سنبھال چھوڑنا اس کی اِک عام ادا تھی ـــــ ہم جو کچھ لکھتے اس کی دست برد سے محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام کرتے کہ وہ کاغذوں کو تہہ کر کے کبھی درازوں میں ڈال دیتا، کبھی کسی کتاب میں رکھ کر بھول جاتا۔ اس کا کہنا تھا کہ میز کو صاف ہونا چاہیے۔ اس پر پھیلے ہُوئے کاغذات بد ذوقی کی علامت ہیں۔ اِستری کروانے جاتا تو استری کروا کے وردی کو وہیں کئی تہوں میں لپیٹتا، پھر پلاسٹک کے ایک لفافے میں ٹھونستا، اسے سائیکل کے پچھلے کیریر پر کستا اور یوں بڑے اہتمام سے وردی کو سائیکل پر "لاد" کر کمرے میں لے آتا۔ جب ہم پہنتے تو اس پر کئی خطوط طول بلد اور عرض بلد نمایاں ہوتے۔ کئی بار اسے آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنے سلیقے پن کا مظاہرہ وردی پر کرنا چھوڑ دے لیکن بے سود۔ آخر ایک دن ہم نے اسے باضابطہ ڈانٹ پلائی اور حکم دیا کہ آئندہ وردی استری کروانے جایا کرے تو ہینگر ساتھ لے جایا کرے۔ اس میں لٹکا کر واپس لایا کرے، وہ چپ ہو رہا۔

دُوسرے دن شام کے وقت مُوسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ ہم برآمدے میں بیٹھے لُطف اندوز ہو رہے تھے کہ دُور سے عقیل سائیکل دوڑاتا نظر آیا۔ وردی استری کروا کے لا رہا تھا جو اس نے "حسبِ حکم" ہینگر میں لٹکا رکھی تھی۔

بات سید اللہ سے چلی تھی جو بنوں میں ہمارا پہلا اَردلی تھا۔ پہلے پہل کے سبھی تجربے حسین ہوتے ہیں۔ ہمیں تو دفتر بھی خوبصورت ملا۔ کشادہ، ہوادار، چمکتے دمکتے فرنیچر سے آراستہ جس میں بیٹھ کر دس بجے کے بعد ہی ہمیں نیند آنے لگتی تھی۔ اِس لیے کہ کام کوئی ہوتا نہیں تھا۔ محض دو بجنے کے انتظار میں کوئی کب تک جاگ سکتا ہے۔ فوج کو غالباً ہماری اس کیفیت کی خبر ہو گئی۔ حکم آیا کہ اِس نیم لفٹین کو دم پخت کرنے کے لیے ایک انفنٹری یونٹ کے ساتھ نتھی کر دیا جائے۔ نیندیں اُڑانے کا کیا خُوب بہانہ تھا۔

ان دنوں یہ یونٹ بنوں سے کوہاٹ آئی ہُوئی تھی اور ٹینکوں کے ساتھ مل کر

جنگ میں حصہ لینے کی تربیت جاری تھی۔

سُنہری دُھوپ کی ایک دمکتی شام کو ہم کوہاٹ میں اِس یونٹ کے تربیتی علاقے میں پہنچے تو دُور سے دیکھا کچھ لوگ والی بال کھیل رہے ہیں اور سُورج کی ڈُوبتی کرنوں میں ان کے سر پیتل کی تھالیوں کی طرح چمک رہے ہیں کہ سب کے سب گنجے تھے۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے اپنے گائیڈ کی طرف دیکھا جو بنوں سے ہمیں چھوڑنے آئے تھے۔ انھوں نے شانے اچکا کر لاعلمی کا اِظہار کیا۔ تعارف ہُوا تو پتہ چلا خیر سے سب افسر ہیں۔ جھجک دُور ہوئی تو سب کے گنجے ہونے کا سبب پوچھا۔ بولے:

"ہماری یونٹ کی روایت ہے کہ سردیوں کے دِنوں میں سب افسر ٹنڈ کرواتے ہیں۔ آپ بھی تیار رہیں۔ صبح تربیت کی ابتدا سر منڈوانے سے ہو گی۔"

سر منڈوانے کی نوبت تو خیر نہیں آئی لیکن اولے وہ زوروں کے پڑے کہ کوئی کسر باقی نہ رہی۔ اکثریت کی ٹنڈ کروانے کی وجہ تسمیہ کسی اور یونٹ کے ایک بزرگوار سینیئر افسر تھے جو خواہ مخواہ اِس یونٹ کے جونیئر افسروں میں کیڑے نکالتے رہتے تھے اور اپنی جوانی کے حوالے دے دے کر لوگوں کے شباب کو چیلنج کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی افسر نے سر میں خشکی کی وجہ سے سارے بال اُتروا دِیے۔ موصوف نے انھیں دیکھا تو ٹوک دیا اور سخت برہمی کا اظہار کیا۔ قواعد و ضوابط کے حوالے بھی دِیے۔ (قواعد کے مطابق بغیر کسی معقول وجہ کے سر کے بال اور ڈاڑھی مُنڈوائی نہیں جا سکتی کہ شناخت کے کاغذات میں ردوبدل کرنا پڑتا ہے)۔ بات دُوسرے افسروں تک پہنچی، سب کے سب ہسپتال جا پہنچے۔ سٹاف سرجن کے حضور پیش ہوتے اور بولے سر میں سخت خارش ہوتی ہے۔ کھجا کھجا کے بُرا حال ہو گیا۔ بال بھی گِر رہے ہیں۔ بال اُتروانے کی اجازت دی جائے۔ سٹاف سرجن نے ان کی بات کا یقین کرتے ہوئے تحریری طور پر لکھ دیا کہ بال اتروا لیں۔ دوسرے دن سے سرسوں کے تیل میں لشکتی دمکتی ٹنڈوں والے افسروں کا پُورا اسکواڈ مذکورہ بالا افسر کی رہائش گاہ کے سامنے سے بار بار گزرتا تھا۔

فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی اِس یونٹ کے ساتھ ہماری تربیت کا آغاز ہوا تو احساس ہوا کہ پی ایم اے میں تربیت کا اِختتام یونٹ لائف کی تربیت کا نُقطۂ آغاز ہے۔ وہاں صرف نظری تعلیم حاصل کی تھی یہاں سب عملی کام تھے۔ پہلے دن ہمیں "سیکشن کمانڈر" کے اعزاز سے نوازا گیا یعنی دس عدد جوان ہماری کمانڈ میں دے دِیے گئے۔ صبح سے لے کر شام تک ہم انہی کی بھاگ دوڑ میں مصروف رہتے۔ صبح اٹھ کر نہ صرف خُود تیار ہوتے بلکہ انھیں بھی وقت پر تیار کر کے مطلوبہ جگہ پہنچانا ہماری ذِمّہ داری تھی۔ کوئی لیٹ ہوتا، طلبی ہماری ہوتی، کوئی جھگڑے میں ملوث ہوتا تو پیشی ہماری۔ کسی کی وردی میں نقص ہوتا، انگلی ہم پر اٹھتی، کسی کا مارچ ٹھیک نہ ہوتا، کارکردگی ہماری زیرِ بحث آتی۔ دس افراد کیا ہوتے، دس ہزار لعنتوں کا سامان ہو گئے۔ ان کا اِنتخاب بھی غالباً بڑے "غور و فکر" کے بعد کیا گیا تھا کہ ہر کوئی چودھویں کا چاند تھا۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ جس کا جدھر مُنہ اُٹھتا، نکل جاتا، جو جی چاہتا پہن کر پریڈ پر چلا آتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ تمام مکالموں کا حاصل تھا، "سوال گندم، جواب چنا۔" پہلے دو چار دن تو ہم بوکھلائے رہے لیکن پھر انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ کام کا آغاز کیا۔ روزانہ سرِ شام ایک ایک کو خیمے میں بلواتے اس سے طویل اِنٹرویو لیتے۔ کون ہے، کہاں کا رہنے والا ہے، کتنی سروس ہو گئی، بہن بھائی کیا کرتے ہیں، یونٹ میں کوئی مسئلہ تو نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ گویا لیڈرشپ کے پہلے اصُول "اپنے ماتحتوں کو جانو" KNOW YOUR MEN پر عمل کا آغاز تھا۔ اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ وہ ہمیں سمجھنے لگے، ہم انھیں۔ افہام و تفہیم کی فضا پیدا ہوئی تو تعلقات میں احترام خُود بخود در آیا۔ مسائل چھٹتے چلے گئے۔ ابھی ہم سیکشن کو بمشکل قابو کر پائے تھے کہ ترقی دے کر پلاٹون حوالدار بنا دِیے گئے۔ ابھی سنبھلنے نہ پاتے تھے کہ پلاٹون کمانڈر کے "رُتبے" پر فائز کر دِیے گئے۔ دو تین مہینوں تک پلاٹون کے ساتھ مغز کھپائی کرتے رہے، پلاٹون کے ہتھیاروں کو سمجھتے رہے۔

ابھی ہم ان ابتدائی مرحلوں ہی سے گزر رہے تھے کہ جی۔ ایچ۔ کیو سے ایک اور ہدایت

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

وصول ہوئی کہ ہمیں جونیئر لیڈر شپ اور افسروں کے استعمال کرنے والے ہتھیاروں کی سکھلائی OFFICERS WEAPONS AND JUNIOR OFFICERS LEADER-SHIP COURSE کے لیے سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس بھیج دیا جاتے۔ یہ سکول کوئٹہ میں واقع ہے جہاں برف گرتی ہے، موسم سرما طویل ہوتا ہے گرما مختصر۔ ہم نے بہتیرا احتجاج کیا کہ ہمارا انتخاب آرمی ایجوکیشن کور کے لیے ہوا تھا۔ ہم سے کوئی پڑھنے لکھنے کا کام لو۔ ہتھیاروں کے ٹریگر دباتے دباتے ہم کہیں قلم پکڑنا ہی نہ بھول جائیں لیکن ہماری ایک نہ سنی گئی۔ کہا گیا تم سپاہی پہلے ہو، اور کچھ بعد میں۔ چنانچہ کورس کی تیاری PRE-COURSE TRAINING کے لیے ہمیں پنجاب رجمنٹ کی ایک یونٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر ہی کے ایک سٹاف افسر (بی ایم) میجر اکرم ترقی پا کر کرنل بنے، اس یونٹ کو کمانڈ کر رہے تھے۔ انھوں نے بڑی شفقتوں سے ہمارے لیے ہتھیاروں کی سکھلائی اور فائرنگ کا اہتمام کروایا۔ کورس پر جانے سے پہلے پورا ایک مہینہ ہم نے فائرنگ رینجز ہی پر گزارا۔ ہماری مشکل یہ تھی کہ پانچ گولیوں کا ایک گروپ فائر کرتے ہوتے، تین یا چار گولیاں تو ٹارگٹ کے وسط BULL EYE میں لگتی تھیں لیکن چوتھی یا پانچویں گولی ہمیشہ دائیں بائیں نکل جاتی۔ ایک دن کرنل اکرم بنفسِ نفیس رینج پر موجود تھے۔ انھوں نے بار بار ہماری آخری گولی کو "گمراہ" ہوتے دیکھا تو ہمارے پاس آئے۔ پوچھا:

"یہ گولی کیوں جا رہی ہے اِدھر اُدھر؟"

"سر! میں تو یہاں سے ٹارگٹ کی طرف ہی بھیجتا ہوں۔ آگے جا کر جانے کیا ہو جاتا ہے انھیں۔"

"نہیں تمھارا کنٹرول ٹھیک نہیں ہے۔ تین چار گولیاں فائر کرنے کے بعد رائفل پر تمھاری گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔"

"سر! بڑا بُرا زمانہ آ گیا ہے۔ آج کل اولاد باپ کا کہا نہیں مانتی۔ یہ تو پھر گولیاں ہیں، دھات کی بنی ہوئی۔"

کرنل اکرم مسکرائے۔ بولے "ہم جانتے ہیں نافرمان گولیوں کو قابو میں لانے کا طریقہ۔" جاتے جاتے وہ ہمیں ایک افسر کے حوالے کر گئے کہ ایک ہفتہ اسے مسکیٹری MUSKETRY

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کروائیں یعنی وہ مشقیں جن سے بازوؤں کے عضلات مضبوط ہوں۔ اور رائفل پر گرفت بہتر ہو سکے۔ اس افسر نے ایک ہفتے تک ہمارا ناک میں دم کیے رکھا۔ فائرنگ کم ہوتی، مسکیٹری زیادہ۔ رائفل سر سے بلند کیے ہم بیٹھکیں نکالتے رہتے۔ مگدر کی طرح بازو گھماتے رہتے یا ڈنڈ پیلتے رہتے۔ ہفتہ بعد فائرنگ ہوئی تو پانچوں گولیاں ہمارا کہا مان رہی تھیں۔

ایک دن مشین گن کا فائر ہو رہا تھا۔ فائر کا حکم ملتے ہی ہم نے تو پوری بیلٹ خالی کر دی۔ ہمارے ساتھ سنٹر سے نیا نیا آیا، ایک جوان لیٹا تھا۔ دیکھا ٹریگر پر انگلی رکھے پسینے میں شرابور ہے۔ ڈیوٹی پر موجود افسر اس کے پاس آیا۔ با آوازِ بلند کہا، "فائر۔"

جوان نے بڑی بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟"

"سر! اِس مشین گن میں بہت سے سوراخ ہیں جو میرے مُنہ کی طرف کھلتے ہیں۔ ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر کس بات کا؟"

"سر! کوئی گولی ادھر سے نہ نکل آئے۔"

"شٹ اپ! فائر!"

جب اُس نے فائر نہ کیا تو اس کا منہ مشین گن کے ساتھ لگا کر کسی اور سے گن فائر کروائی گئی۔ بیلٹ خالی ہوئی تو جوان بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ تربیت کے ابتدائی مرحلوں میں ایسے مظاہرے عام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ شرمیلے لڑکے، تنومند سپاہیوں میں، نزاکتیں حوصلوں میں اور ڈر خوف، بے باکیوں میں بدل جاتے ہیں۔

لیکن انفنٹری سکول میں صرف فائرنگ ہی نہیں ہوتی اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے کورس کے آغاز ہی سے نوجوان افسروں کو سنگینی لڑائی BAYONET FIGHTING میں مصروف کر دیا جاتا ہے کہ ان کی اٹھتی جوانیوں اور نئی افسری کے دو آتشہ نشے ہرن کرنے کا یہ تیر بہدف نسخہ ہے۔ ہم جب کوئٹہ پہنچے تو موسم سرما نے رختِ سفر باندھ تو لیا تھا لیکن ابھی رُخصت نہیں ہوا تھا۔ میدانوں سے برف پگھل چکی تھی۔ البتہ پہاڑوں کی چوٹیوں نے ابھی تک سفید چادریں

اوڑھ رکھی تھیں۔ پالی کاٹ کھانے کو بے تاب رہتا تھا اور ہوائیں ہڈیوں کو بھاتی رہتی تھیں۔ خون منجمد کر دینے والی ایسی سردی میں لوہے کو ہاتھوں میں تھامنے بلکہ تھامے رکھنے کے عذاب سے وہی لوگ واقف ہیں جو اس سے گزرے ہوں۔ اِس پر شاف کا یہ مطالبہ بھی ہوتا کہ سنگینی لڑائی میں چیخ و پکار بھی پُورے زور شور سے جاری رہنی چاہیے۔ کتنی ہی سردی ہو، شاف کی بیٹری کبھی ڈاؤن نہیں ہوتی تھی، اس کے حلق کے والیوم VOLUME بھی پورے کے پُورے کھلے رہتے تھے۔ جی تھری رائفل پر ننگی سنگین چڑھائے پہلے وہ خُود حملے کا مظاہرہ کرتا، ساتھ ساتھ کمنٹری جاری رہتی۔ اچھا خاصا اٹن شن پوزیشن میں کھڑا ہے۔ اچانک اس نے پُورا حلق پھاڑ کر نعرہ لگایا:

"آن گارڈ ON GUARD

زمین دہل گئی۔ شاف نے رائفل فضا میں اس طرح اُچھالی کہ کندھوں کی بلندی سے گِر کر وہ سِیدھی ہُوئی تو نالی کا رُخ سامنے دشمن کی طرف۔ اس دوران شاف اس پر لپکا اور کھٹاک کی آواز پیدا کرتے ہُوئے اسے ایسے قابو میں لیا جیسے لوہا لوہے سے ٹکرا گیا۔ پوزیشن یہ کہ بٹ پلیٹ بغل میں دَبی ہوئی، بایاں ہاتھ نالی سے لپٹا ہُوا، دایاں ہاتھ ٹریگر کے اِردگرد، بایاں پاؤں آگے، دایاں پیچھے۔

"اب آپ اپنی حفاظت کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ دُشمن پر حملہ کرنے کے لیے چہرے پر بُری طرح غضب طاری کریں، شکل سُور جیسی بنائیں اور گلے کی پوری طاقت اِستعمال کرتے ہُوئے پکاریں: "چارج۔ پھر آگے بڑھیں۔"

شاف تُلے تلے قدموں سے آگے بڑھتا ہے۔ فرضی دشمن کے پیٹ میں سنگین گھونپ کر نکالتا ہے اور چیختا ہے۔" پوائنٹ۔ وِڈرا۔

دشمن راہیٔ مُلکِ عدم ہو جاتا ہے۔ اور شاف "حیدر" کا نعرہ لگاتا ہُوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ بات صرف مظاہروں تک محدود رہتی تو ہم یقیناً شاف کی پھرتی، تیزی اور قوت کی داد دیتے لیکن دو تین مظاہروں کے بعد ہی شاف نے ہمیں صف آرا کیا۔ سنگین کے کور اُتروائے اور دشمن سے دست بدست لڑائی کا آغاز کروا دیا۔ کچھ دیر بعد شاف نے

اِنفرادی طور پر مشقیں کروانی شروع کیں۔ ایک افسر کو باہر نکالا، "صاحب ذرا بتائیں، کیا سیکھا آپ نے؟"

"آن گارڈ" افسر دھاڑا اور رائفل سیدھی کرتے ہوئے حملے کے لیے تیار ہو گیا۔

"اب ہم اپنی حفاظت کی پوزیشن میں ہیں۔ دُشمن پر حملہ کرنے کے لیے چہرے پر غصّہ طاری کریں۔ شکل . . . . . ."۔

"ہاں ہاں! شکل سوّر جیسی بنائیں"۔ شاف نے لُقمہ دیا۔

"شاف! آپ جیسی شکل تو نہیں بنا سکتا میں"۔ افسر نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

"آپ کوشش تو کریں"۔ سیدھا سادا شاف پُورے انہماک سے افسر کی طرف متوجہ تھا ادھر باقی افسر بڑی مشکلوں سے ہنسی روک رہے تھے۔

شاف نے ان افسروں کو ہنستے دیکھا تو بات اس کے پلّے پڑی۔ تب اس نے سنگینی لڑائی کو کیا برطرف اور "سنگین تربیت" کا کیا آغاز۔ پُورے سکواڈ کو پتھریلی زمین پر لٹایا اور کہنیوں کے بل کرالنگ CRAWLING کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر ہی میں سارے قہقہے رخصت ہو گئے۔

انفنٹری سکول میں تربیت کامیابی سے مکمل کرنے کے بعد ہم واپس بنوں پہنچے۔ تو فرنٹیئر فورس والی یونٹ بنوں کے مضافاتی علاقے دربوبہ میں خیمہ کش تھی۔ جس دن ہم یونٹ پہنچے، اس دن ہماری کمپنی کے سبھی افسر کسی اور یونٹ کی فوجی مشقوں میں ایمپائر بن کر رُخصت ہُوئے اور پُوری کمپنی کی کمانڈ ہمیں سونپ دی گئی۔

ان دِنوں گشتی دستوں کی مشقیں جاری تھیں۔ یونٹ کی چاروں کمپنیوں کو تین تین چار چار میل کے فاصلے پر مختلف سمتوں میں بکھیر دیا گیا تھا۔ ہم اے کمپنی کے کمانڈر قرار پاتے تھے اور ڈی" کمپنی ہمارے لیے" دشمن" قرار دے دی گئی تھی۔ ہمارا کام یہ تھا کہ رات کے اندھیروں میں چھپ چھپا کر اس کا کھوج لگائیں اور اسے تباہ و برباد کرنے کا بندوبست کریں۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر کی طرف سے مختلف صوبیداروں کو ایمپائر مقرر کر دیا گیا تھا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

پہلے دن کمپنی کی کمانڈ سنبھالی تو فخر سے زیادہ ذِمّہ داری کا احساس غالب تھا۔ ہم نے کمپنی کے چار حِصّے کیے۔ ایک کو کمپنی کی حفاظت پر مامور کیا۔ تین کو گشتی دستوں میں ترتیب دیا۔ ایک دستے کی قیادت خُود سنبھالی۔ باقی دو دستوں کے کمانڈروں کو وُہ ادھوری معلومات بہم پہنچائیں جو بالاہیڈ کوارٹر کی طرف سے دشمن کے "جائے قیام" کے بارے میں مِلی تھیں۔ پھر مختلف راستوں سے انھیں دشمن کی سُن گُن لینے کے لیے روانہ کر دیا۔

نقشے کا مطالعہ کر کے ہم نے اپنے لیے ایک تیسرے رستے کا اِنتخاب کیا۔ رات کا اندھیرا پھیلا تو ہم نے کوچ کیا۔ کیمپ سے تھوڑی دُور ہی گئے ہوں گے کہ ایک رستہ نشیب میں اترتا نظر آیا۔ نقشوں کے مطابق ہم نے جس راستے کا اِنتخاب کیا تھا۔ اس کے مطابق ہمیں بائیں جانب دریا کی تلہیٹی میں اترنا تھا اور یہ راستہ دائیں طرف لے جاتا تھا۔ ہم اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ یہ ہماری پہلی غلطی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں زمینی نشانات دو جمع دو چار کی طرح نہیں ہوتے، خاصی مغز ماری کرنی پڑتی ہے۔ رستہ وُہی تھا جو بل کھا کر ہمیں مطلوبہ راستوں پر لے جاتا لیکن اب ہم آگے آ چکے تھے۔ ساری ترتیب الٹ پلٹ گئی تھی۔ واپس جانے میں ایک جھُوٹا وقار مانع تھا۔ جوان کیا کہیں گے "صاحب راستہ بھُول گئے"۔ سچ ہے جو اپنی غلطی تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا، ناکامیاں در گمراہیاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔ ہم اور آگے بڑھے تو نقشے کی وہ ساری لکیریں جو ذہن میں بٹھائی تھیں، آپس میں گڈمڈ ہو گئیں، تمام راستے درہم برہم ہو گئے، رات کی تاریکیوں میں سب پہاڑ آپس میں مدغم ہو گئے۔ ساری نقشہ دانی دھری کی دھری رہ گئی۔ ایک اندھیرا تھا جو ہر سُو چھایا ہوا تھا۔ اور ہم تھے کہ اندھیروں میں تیر چلاتے، قدم بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ اچانک خود کو ایک کھلے میدان میں کھڑے پایا جس کے چاروں طرف پہاڑ کھڑے تھے، ہماری نقشہ دانی کے مطابق ہمارے کیمپ کے دس دس میل کے علاقے میں کوئی میدان نہیں تھا۔ اِس میدان کو بھی وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ابھی ہم اس میدان کے وجود کی وجہِ جواز ہی پر غور فرما رہے تھے کہ چاروں طرف سے مشین گنوں کی تڑ تڑ شروع

ہو گئی★۔ یک نہ شد۔ دو شد۔ کہاں تو ہم پہاڑوں کے بیچ میں میدان کے ہونے پر معترض تھے، کہاں دشمن بھی نکل آیا۔ ہم نے بلند آواز میں پورے دستے کو زمین فنگ ہونے اور جوابی فائرنگ کا حُکم دیا۔ تھوڑی دیر دونوں طرف سے فائرنگ جاری رہی۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر کے ایمپائر نے وِصل بجا کر اس پہلی جھڑپ کے خاتمے کا حُکم دیا۔ فائرنگ رُکی تو ایمپائر نے فیصلہ سنایا۔

"سر! آپ نے تو مروا دیا اپنے پُورے دستے کو۔ اب کیا کریں گے آپ؟"

"ہم اس کے فیصلے کو چیلنج کرنے ہی والے تھے کہ اس نے وضاحت کی۔

"سر! ایک تو آپ کھُلے میدان میں کھڑے ہیں جہاں دشمن آپ کو دیکھ رہا ہے آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ فائر کس سمت سے آیا۔ دوسرے رہی سہی کسر آپ نے بلند آواز میں اپنے دستے کو زمین فنگ ہونے کا حُکم دے کر پوری کر دی۔ آپ "دشمن" کے علاقے میں ہیں ڈرل سکیئر میں تو نہیں — جو تھوڑی بہت بچت ہو سکتی تھی۔ آپ نے فائرنگ کروا کے پُوری کر دی۔ آپ کا پُورا دستہ بے سوچے سمجھے بے تحاشا فائرنگ کرتا رہا۔ مشین گنوں سے اگلتے شعلے اور فائرنگ کی آواز سے دشمن کو آپ کی صحیح پوزیشن معلوم ہو گئی۔ اس نے بڑے اِطمینان سے آپ کو بھُونا ہے۔ اور اس ساری کارروائی کے دوران میں آپ زمین پر لیٹے صرف فائرنگ کرتے رہے ہیں، کِس طرف، معلوم نہیں۔ آپ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ دشمن ہے کس پہاڑ پر۔ پتہ چلا ہو تو بتا دیں، میں آدھی پلاٹون زندہ کرنے کو تیار ہوں۔

ہم نے بے بسی سے اس مسیحا کی طرف دیکھا جو "مُردوں" کو جِلانے کے لیے "دشمن" سے تعارف کو شرط قرار دے رہا تھا۔ باتیں اس کی ساری درست تھیں۔

★ فوجی مشقوں کے اِبتدائی مرحلوں میں لکڑیوں کے مختلف RATTLERS کے ذریعے رائفل، مشین گن اور دُوسرے ہتھیاروں کی آوازیں نکالی جاتی ہیں بعد ازاں کچھ مشقوں میں اصلی ہتھیار مع ایمونیشن استعمال کیے جاتے ہیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہمیں اب احساس ہوا کہ ہم کتنی فاش غلطیوں کے مرتکب ہوئے تھے۔ اب تک ہم صرف اپنی نقشہ دانی پر اعتماد کرتے آئے تھے۔ طے شدہ راستہ بھولنے کی صورت میں متبادل تدبیر، دشمن کے گشتی دستوں سے مڈبھیڑ ہونے پر صحیح سلامت واپسی کا طریقِ کار، زخمیوں کی مرہم پٹی، تاخیر ہونے کی صورت میں خوراک وغیرہ کا اِنتظام۔ اور بہت سی چیزیں تھیں جن پر ہم نے غور نہیں کیا تھا۔ بس کمانڈری کے جوش میں پورے دستے کو لے کر نکل کھڑے ہوئے تھے جیسے ولیمے کی دعوت پر جا رہے ہوں۔ ایمپائر صوبیدار خان آگ اُگل رہا تھا: "سر! آپ نے دشمن کے بارے میں یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ مزے سے اپنے کیمپ میں بیٹھا آگ تاپ رہا ہوگا۔ اس کے پاس بھی عقل ہے۔ ہر وہ راستہ جو اس کے کیمپ کو جاتا ہے' اس کی نظر میں ہے اور اس نے ہر جگہ آپ کے اِستقبال کا یقیناً بندوبست کر رکھا ہوگا۔ آپ نے ان چھوٹی موٹی ٹولیوں سے بچ کر ہی تو دشمن کے کیمپ تک پہنچنا تھا۔ آپ ہر جگہ اسی طرح اُلجھتے رہے تو پہنچ لیے کیمپ تک۔" ایمپائر صوبیدار تھا اور ہم افسر' چاہے نیم لیفٹین ہی سہی۔ چاہتے تو ڈانٹ پلا کر اسے خاموش کروا سکتے تھے۔ لیکن ہم نے سوچا یہ صوبیدار کی نہیں' حق کی آواز ہے جو بلند ہو رہی ہے' اسے بلند ہی رہنا چاہیے۔ سچی بات کو سینیارٹی کے زور سے کہاں دبایا جا سکتا ہے۔

تب ہمیں پی ایم اے اور انفنٹری سکول میں پڑھائے گئے سبق یاد آئے۔ دشمن کو شکست دینے کا ایک اصول حیرانی SURPRISE ہے۔ "اس تک ایسے راستوں سے پہنچو کہ اس کے گمان میں بھی نہ آئیں' ایسے وقت میں حملہ کرو جب وہ غافل ہو' ایسے ہتھیار اِستعمال کرو جو اس نے دیکھے نہ ہوں۔ ایسی تدبیر نکالو کہ وہ دنگ رہ جائے۔"

جوان بکھری لاشوں کی طرح زمین پر پڑے تھے۔ ایمپائر تھا کہ زخموں پر نمک پاشی کیے جا رہا تھا۔ دِل میں خواہش اُبھری۔ "اے کاش ہم واقعی شہید ہو جاتے۔"

بالآخر ایمپائر کے تبصرے ختم ہوئے۔ اس نے آئندہ احتیاط سے کام لینے کی تاکید کرتے ہوئے پورے دستے کو "زندہ" ہونے کا حکم دیا۔ راہیں تو ہم بھلا ہی بیٹھے تھے، دشمن کا خاک پتہ چلنا۔ جس راستے پر آگے بڑھتے' مشین گنوں کی تڑتڑ سنائی دیتی۔ ساری رات

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

بھٹکنے کے بعد آخری پہر واپس آئے۔ باقی دستے بھی واپس آ چکے تھے لیکن کسی کو "دشمن" کی کوئی خبر نہ مِلی تھی البتہ وہ بھی جگہ جگہ دشمن کے ہاتھوں "مارے" گئے تھے۔

ایک دو گھڑی آرام کرنے کے بعد ہم نے نقشے پھیلائے۔ پی ایم اے اور انفنٹری سکول کے بھولے ہوئے سبق یاد کیے۔ تمام پہلوؤں پر تفصیلی غور کیا، باقی دستوں کے لیے احکامات مرتب ہوئے، خود اپنے لیے تمام نکات نوٹ کیے۔ عصر کے وقت اہم افراد کا اجلاس طلب کیا اور مفصل احکامات سنائے۔ مغرب کے بعد باقی دستوں کو دشمن کے علاقے کی طرف روانہ کیا۔ اپنے دستے کو طلب کیا اور پھر جیسے چوری چھپے محبوب سے ملنے کی تفصیلات طے کی جاتی ہیں ؎

کانچ کی چوڑیاں کل رات نہ ہوں ہاتھوں میں
اتنی اونچی تری پازیب کی جھنکار نہ ہو
سرسراتا ہوا ملبوس نہ لہرا جائے
کسی سایے کا گماں بھی پسِ دیوار نہ ہو

ہم نے اپنے زیرِ کمان دستے کو تیاری کی ہدایات جاری کیں۔ سر پر ٹوپی ہو لیکن بیج نہ ہو کہ چاند کی روشنی میں چمک کر کسی کے ہونے کا پتہ دے، جوتے ہوں لیکن ربڑ سول والے کہ چلتے ہوئے آواز نہ ہو' وردی ہو لیکن ڈھیلی نہ ہو کہ خاردار جھاڑیوں میں اُلجھ کر منزل کھوٹی کر دے۔ چلنا ہوگا لیکن بلندیوں سے بچ کر' نشیب میں اُتر کر کہ "دشمن" کو سایے کا گمان بھی نہ ہو۔ فلاں سب سے آگے ہوگا، فلاں اس کے پیچھے' فلاں سب کے پیچھے، فلاں کے ہاتھ میں مشین گن ہوگی' فلاں کے پاس طبّی امداد کا سامان — فلاں خشک راشن اٹھائے گا' فلاں وائرلیس سیٹ —— غرض آج ہر طرح تیاریاں مکمل تھیں۔ دشمن سے راستے میں مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں اشارے بھی مقرر تھے کہ کس اشارے پر کس کو کیا کرنا ہوگا، کس اشارے پر کس طرف سے پیچھے ہٹنا ہوگا، کس سمت میں آگے بڑھنا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

تیاریاں رنگ لائیں' ہر طرح خیریت رہی۔ ایک دو جگہ دشمن کے گشتی دستوں

سے ملاقات ہُوئی، فائر بھی آیا لیکن ہم مسادھے خاموش رہے، منزل کھوٹی نہ ہونے دی اور دامن بچا کے صاف نکل گئے۔ ایمپائر حیران ہو رہا تھا۔ بولا، "سر! یہ ایک دن میں اتنا کچھ کیسے سیکھ لیا آپ نے ؟"

یہ ایک دن کی نہیں۔ پی ایم اے کی ایک سال کی سکھلائی تھی، انفنٹری سکول میں تین مہینوں کی مشقت تھی، جسے ہم نے بھلا دیا تھا۔ خود اس کی گزشتہ رات کی تقریر نے بھولے ہُوئے سارے سبق یاد دلاتے تھے۔

یوں تو ہر طرح خیریت رہی لیکن دشمن کے کیمپ کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ رات کا پچھلا پہر آیا تو ہم نے دو چلتے پرزوں کا اِنتخاب کیا۔ انھیں ہلکے ہتھیاروں سے مسلّح کیا۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا انھیں تھمایا اور ہدایت دی کہ کسی اوٹ یا کھوہ میں چھپ کر بیٹھ رہیں۔ صبح کے وقت یقیناً دشمن کے کیمپ میں ناشتے کی سرگرمیاں ہوں گی۔ آگ جلے گی تو دھوآں بھی اٹھے گا جو دُور سے نظر آجاتا ہے۔ پانی کے حصُول کے لیے بھی دشمن کی مختلف ٹولیاں باہر نکلنے کا امکان ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راشن، پیٹرول، ایمونیشن وغیرہ کے لیے گاڑیوں کی آمد و رفت ہو۔ ان کا کام تھا کہ سانس روکے بس دیکھتے رہیں اور کیمپ کا پتہ لگ جائے تو پہاڑ کی چوٹیوں، درختوں، راستوں کے حوالوں سے جگہ کو اچھی طرح یاد کر لیں۔ سمت نما آلہ کمپاس بھی ان کے حوالے کر دیا گیا۔ کہ مختلف جگہوں سے بیرنگ BEARING بھی پڑھ لیں۔ ایسے افراد کو نائٹ واچ مین NIGHT·WATCH·MEN کہتے ہیں۔ تفصیلی ہدایات کے بعد ہم نے انھیں خُدا کے حوالے کیا اور خود دستے کو لے کر بحفاظت کیمپ پہنچ گئے۔

ہم تو بحفاظت کیمپ پہنچ گئے لیکن کیمپ میں خیریت نہ تھی۔ ہمیں ایک اور حماقت کا احساس ہوا۔ ہم دشمن کی تلاش میں تھے اور ساری توجہ اسی پہ مرکوز کرتے ہُوئے گشتی دستوں کا مِشن کامیاب بنانے پر غور کرتے رہے تھے۔ پیچھے دشمن کیمپ پہ شب خُون مار گیا تھا۔ اور کیمپ میں موجود ایک ایمپائر نے آدھے سے زیادہ افراد کو "شہید" قرار دے ڈالا تھا۔ زخمیوں کی "مرہم پٹی" اور "شہداء" کی "تدفین" کے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لیے گویا ہم تین گھنٹوں سے پہلے آرام نہیں کر سکتے تھے۔ تھکن طاری ہوتے ہُوئے بھی خُود کو جگائے رکھنا اور ہر طرح کی مشکلات میں ذہن کو حاضر رکھنا بھی تو تربیت کا ایک حِصّہ ہے۔ دشمن کے حملے پر ریئر پارٹی کمانڈر بے جگری سے لڑا تھا۔ اور اس نے بھاگتے دشمن کے دو سپاہی بھی قید کر لیے تھے لیکن کیمپ ایمپائر نے اعلان کر دیا تھا کہ دونوں قیدیوں نے گرفتاری سے پہلے خُود کو "شوٹ" کر لیا ہے سخت غُصّہ آیا۔ انھیں "خُودکشی" کا کیس قرار نہ دیا جاتا تو دشمن کے کیمپ کے بارے میں معلومات اگلوانا مشکل نہیں تھا لیکن ہمیں شبہ ہو چلا تھا کہ سارے ایمپائر دشمن سے ملے ہُوئے ہیں۔

دُوسرا دن بھی منصُوبہ بندی میں گزُر گیا۔ دشمن کے بارے میں چھان بین کے علاوہ اپنے کیمپ کے دفاع پر بھی ہم نے خصوصی توجہ دی۔ انھیں مختلف ٹولیوں میں بانٹا، خیموں کی ترتیب بدلی۔ کیمپ آنے والے راستوں پر گھات لگائی، مختلف بلندیوں پر دیکھ بھال کی چوکیاں قائم کیں۔ دوپہر تک، کیمپ پر حملہ ہونے کی صُورت میں کی جانے والی کارروائیوں کی ایک دو ریہرسل بھی کر ڈالیں۔ اور پھر دشمن کے فراق میں کھو گئے۔

صُوبیدار لعل خان پر رہ رہ کر غُصّہ آ رہا تھا۔ ڈی کمپنی کے افسر بھی ایمپائر بن کر دوسرے یونٹوں کو گئے ہُوئے تھے اور کمپنی کی کمان لعل خان کے ہاتھ آ گئی تھی۔ ہم اس صوبیدار کی بہت عِزّت کرتے تھے کہ اپنے پیشے میں مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ لیکن اس دن ہمیں اس پر سخت غُصّہ آ رہا تھا۔ کم بخت نے پوری کمپنی کو کمّی بنا کر کہیں چپکا چھوڑا تھا۔ دو راتوں سے ہمارے تین دستے اِس کمپنی کی تلاش میں تھے۔ کمپنی کا سراغ تو کیا ملتا اُلٹا ہمارا کیمپ برباد کر دیا گیا تھا ــ ہم دانت پیس رہے تھے لیکن اس سے اس کا کیا بگڑتا تھا۔

پشیمان بیٹھے تھے کہ سرِشام نائٹ واچ مین واپس آتے دکھائی دیے۔ ہم نے بڑھ کر انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ معلوم ہُوا کہ دشمن کے کیمپ کا سراغ لگا آئے ہیں۔

ہماری توقعات کے عین مطابق انھیں صبح صبح ایک جگہ سے دھوآں اُٹھتا نظر آیا تھا لیکن فاصلہ زیادہ تھا۔ جب تک وہ ایک پہاڑ سے اتر کر دُوسرے تک پہنچے ۔

دھوَاں ختم ہوگیا تھا۔ انھوں نے اندازے سے ایک مقام کا تعین کر کے مختلف زاویوں سے اس کی کیاس بیرنگ لے لی تھی اور انھیں یقین تھا کہ وہ حملہ آور دستوں کی صحیح رہنمائی کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

خُدا پر بھروسہ کرتے ہُوئے تمام دستوں کو ساتھ لیے ہم رات کو روانہ ہُوئے۔ مطلوبہ علاقے تک تو پہنچ گئے لیکن "دشمن" پھر غائب۔ گائیڈ رستہ بھُول گئے تھے یا "دشمن" کہیں اور کوچ کر گیا تھا۔ ہم نے تمام افراد کو ایک پہاڑ کے دامن میں بٹھایا اور دو تین افراد کو ساتھ لے کر علاقے کا جائزہ لینے لگے۔ محنت رنگ لائی۔ دُور سے ایک سگریٹ جلتی نظر آئی۔ یقیناً کوئی سنتری تھا جو سکیورٹی کے احکامات نظر انداز کرتے ہُوئے انتہائی لاپرواہی سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیروں میں ایک جلتا سگریٹ دُور سے واضح نظر آتا ہے۔ ہم نے سمت کا تعین کیا باقی لوگوں کو وارننگ دی اور خُود آگے بڑھ گئے۔ قریب پہنچتے پہنچتے جلتا ہُوا سگریٹ تو غائب ہو گیا لیکن ہم مطلوبہ مقام تک پہنچ چکے تھے کہ ایک پہاڑ پر سے مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم اور قریب ہُوئے تو صوبیدار لعل خان کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس نے کمپنی کے لیے اتنی خُوبصورت جگہ کا اِنتخاب کیا تھا کہ کوئی سو گز سے بھی گزرتا تو کمپنی کی موجودگی کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ یہ جگہ تین طرف سے پہاڑوں میں گھِری ہُوئی تھی، چوتھی طرف سے نشیب تھا اور یقیناً آنے جانے کے لیے اِستعمال ہوتا ہوگا۔ ہمارے اِستقبال کے لیے بھی انھوں نے اس راستے کو مشین گنوں سے "کور" کر رکھا ہوگا۔ ہم نے بھی نچلے پر دہلا مارنے کا فیصلہ کیا۔ باقی تین اطراف سے اُوپر چڑھنا مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں تھا۔۔۔ واپس آئے۔ تینوں دستوں کو اچھی طرح سے سمتیں سمجھائیں۔ پھر دبے پاؤں آگے بڑھ گئے۔

کیمپ کی پُشت سے اُوپر چڑھے تو کسی خیمے سے ٹیپ ریکارڈر پر گیت بلند ہو رہا تھا ۔

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ہم نے گھڑی کی طرف دیکھا، مقرّرہ وقت میں دو منٹ باقی تھے۔ ہم نے دشمن

کے کاروبار چلانے کو تھوڑا مؤخر کیا اور خاموشی سے گیت سُنتے رہے۔ گھڑی کی سوئیاں گلے ملیں تو ہم وائرلیس پر پکارے "ہو جائے۔" یہ حملہ کرنے کا خُفیہ اشارہ CODE WORD تھا۔ تکبیر کے نعرے گُونجے اور مشین گنوں، رائفلوں، راکٹ لانچروں کے دہانے کھُل گئے۔ دشمن بے خبری میں مارا گیا۔ گرچہ کچھ دیر بعد ان کی طرف سے جوابی کاروائی کا آغاز ہُوا لیکن جب تک ہم کیمپ میں داخل ہو چکے تھے۔ دونوں طرف کے ایمپائر ہماری کامیابی پر متفق تھے۔

جھڑپ ختم ہوئی تو ہم صوبیدار لعل خان سے بغلگیر ہُوئے۔ انھیں کمپنی کے لیے شاندار جگہ چننے، ہمارے ہاتھوں دو راتیں بچے رہنے اور اپنے کیمپ کو "تباہ و برباد" کرنے پر مبارکباد دی۔ جواب میں انھوں نے ہمیں گرم گرم چائے پلائی جو اتنے "کامیاب" حملے" کے بعد ہمارا حق بنتا تھا۔۔۔ صوبیدار خان اتنی ہی بلند آواز میں ہماری تعریف میں رطب اللسان تھا۔ جتنی بلند آواز میں پہلی رات ہم پر برس رہا تھا۔

گشتی دستوں کی مشقوں کی یہ آخری رات تھی۔ صبح ہمیں بٹالین ہیڈ کوارٹر سے واپسی کا حُکم ملا۔ ہم کمپنی کو لے کر واپس پہنچے تو باقی کمپنیاں بھی واپس آ چکی تھیں۔ دُوسری یونٹوں میں گئے ہُوئے افسر بھی واپس آ گئے تھے۔ یوں ہماری تین روزہ سنسنی خیز کمانڈ ختم ہوگئی۔

اس کے بعد چند روز تک کمپنی کی سطح پر دشمن سے ملاپ کے لیے پیش قدمی ADVANCE TO CONTACT اور جارحانہ حملوں کی تربیت جاری رہی جس میں ایمپائر دوسری یونٹوں کے افسر تھے۔

ایک حملے میں ہم کمپنی افسر کے طور پر کمپنی کے پیچھے پیچھے تھے۔ جب آخری ضرب لگانے کا موقع آیا تو ہم پر سچ مچ جوش طاری ہو گیا۔ ہم نعرے لگاتے، جوانوں کے حوصلے بڑھاتے آگے بڑھے۔ دشمن گرچہ کافی اونچائی پر واقع تھا لیکن پھولتی سانسوں، ڈوبتی نبضوں کے باوجود ہم نے ہمت نہ ہاری اور مختلف پتھروں، تودوں کی آڑ لیتے اوپر چڑھتے گئے۔ ابھی درمیان ہی میں تھے کہ دیکھا ہماری بائیں طرف کی پلاٹون ٹارگٹ چوٹی کی بجائے اپنی بائیں والی چوٹی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہم نے آواز دے کر انھیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن "گولیوں کی سنسناہٹ" میں آواز ان تک کیسے پہنچ پاتی۔ عین اس وقت کمپنی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کمانڈر کا وائرلیس اپریٹر وائرلیس اُٹھاتے ہماری طرف آتا نظر آیا۔ ہم نے ہینڈسیٹ پکڑا اور پلاٹون کمانڈر کو پکارا۔ جواب آنے پر اسے اس کی حماقت کا احساس دلایا اور پلاٹون کا رُخ دائیں طرف موڑنے کو کہا۔ تھوڑی دیر کو ان کا ایڈوانس رُک گیا اور پھر وہ مطلوبہ چوٹی کی طرف بڑھنے لگے۔ جب چوٹی تھوڑی دُور رہ گئی تو ہم چاروں طرف سے "دشمن" پر ٹوٹ پڑے۔ قریب پہنچے تو ایمپائر مسکرا رہے تھے۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ انھوں نے انگوٹھوں کے اِشاروں سے ہمیں کامیابی کا سِگنل دیا۔ ہم نے ویری لائٹ پسٹل سے سبز گولہ ہوا میں فائر کیا۔ یہ کامیابی کا سگنل تھا۔ جس کے بعد طبی امداد، ریزرو ایمونیشن، راشن وغیرہ والی پارٹی نے آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد حالات معمول پر آتے تو معلوم ہُوا کہ کمپنی کمانڈر کیپٹن حیدر کو حملے کے دوران میں "شہید" قرار دیتے ہُوئے ایمپائروں نے اعلان کیا تھا کہ ہم کمپنی کی کمانڈ سنبھال لیں۔ وائرلیس اپریٹر یہ اعلان سُننے کے بعد ہی کیپٹن حیدر کو چھوڑ کر ہم سے آن ملا تھا لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ کمپنی کی کمانڈ ہماری طرف منتقل ہو گئی ہے۔ حملہ کامیاب رہا تھا اِس لیے ہم نے اپنی لاعلمی کا اظہار مناسب نہ سمجھا اور کامیابی کا سہرا اپنے سر بندھنے دیا۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے۔ "شکست یتیم ہوتی ہے (اس کا کوئی وارث نہیں بنتا) فتح کو بہتیرے سرپرست مِل جاتے ہیں"

Defeat is an orphan, victory has many godfathers.

اس کے بعد بھی مختلف مشقیں جاری رہیں جن میں ایک ڈیم کے کنارے پانی کی مشقیں مثلاً واٹرمین شِپ، ڈُوبتے آدمیوں کو بچانا، کشتیاں نہ ہونے کی صُورت میں جنگل سے کاٹی گئی لکڑیوں یا گاڑیوں کے ٹائروں کی ٹیوبیں کی مدد سے اسلحہ سمیت دریا عبور کرنا، پانی کی رکاوٹیں عبور کر کے دشمن پر حملہ آور ہونا وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان مشقوں میں کبھی حماقتوں نے ہمیں سرنگوں کر دیا، کبھی کامیابیوں نے سرخرو ــــ تربیت کی تراش خراش جاری رہی اور وہ وقت بھی آیا جب لوگوں نے ہمیں برملا کہنا شروع کر دیا کہ اب ایجوکیشن کور میں تمھارا کیا کام، قلم توڑ دو اور پکے پکے انفنٹری میں شامل ہو جاؤ۔ یہ تجاویز اور مشورے غالباً جی ایچ کیو تک جا پہنچے۔ ہمیں انفنٹری یونٹ سے اچک لیا گیا اور مسلح افواج کے محکمہ تعلقاتِ عامہ یعنی انٹر سروسز پبلک ریلیشنز ڈائریکٹوریٹ میں متعین کر دیا گیا۔

تحریر و پیش کش ــــ مدیرِ ہلال

ہم آئی ایس پی آر میں نازل ہوئے تو مختلف کام ہمارے سپرد کیے گئے۔ ہمیں ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔ ایم ٹی او (میکینکل ٹرانسپورٹ آفیسر) بنا دِیے گئے۔ ڈرائیونگ اچھی طرح سیکھ لی اور ڈرائیوروں کو کچھ کچھ سیدھا کیا تو فلم اینڈ فوٹو سیکشن کے انچارج بنا دِیے گئے۔ اس وقت ہمیں کیمرہ پکڑنا بھی نہ آتا تھا۔ فوٹوگرافی سیکھی، فلم ڈویلپ کرنا اور پرنٹ نکالنے سیکھے۔ جب فوٹوگرافروں اور ڈارک رُوم کے کارکنوں سے افہام و تفہیم کی فضا پیدا ہوئی تو اکرام قمر (مرحوم) رُخصت پر چلے گئے۔ ہفت روزہ 'ہلال' کی ادارت عارضی طور پر ہمیں سونپ دی گئی۔

انہی دنوں ہم ریڈیو پاکستان کے "فوجی بھائیوں کے پروگرام" کے لیے بھی ہفتے عشرے میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے۔ ہلال کی ادارت سنبھالنے پر جن کیفیات سے گزرنا پڑا، وہ ہم نے ایک فیچر کی شکل میں قلمبند کیں۔ یہ فیچر ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے نشر ہُوا۔ پیشِ خدمت ہے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اِداریہ

کِردار

ایڈیٹر
ہیڈ کیلیگرافسٹ : چشتی
مسز بلال
ڈارک رُوم انچارج
کسی سیمنٹ ایجنسی کا سٹور مین
صُوبیدار علم دین
نِسوانی آواز
بریگیڈیر
چپڑاسی

(اوپننگ میوزک۔ کاغذ کے اوراق الٹنے پلٹنے کی آوازیں)

ایڈیٹر : چشتی صاحب! کتنی کتابت مکمل ہو گئی۔

چشتی : بس سر! تمام کاپیاں مکمل ہیں۔ صرف اداریہ رہ گیا ہے۔ وہ آپ نے دیا ہی نہیں اب تک۔

ایڈیٹر : اوہ ـــــ وہ تو میں بھُول ہی گیا تھا۔ چلیں آج پہلا کام یہی کرتا ہُوں۔ آپ یہ کاپیاں لے جائیں اور کتابت کی غلطیاں درست کروائیں اور ہاں ان تصویروں کو

ڈارک رُوم میں بھجوا دیں پوزیٹو بنوانے کے لیے۔

چشتی : ٹھیک ہے سر!

(چشتی جاتا ہے۔ کاغذ سمیٹنے اور قدموں کی دُور ہوتی ہوئی آواز)

ایڈیٹر : (خُود کلامی کے انداز میں)

ہوں ـــــ ۔ تو اداریہ رہتا ہے ـــــ کس موضوع پر لکھا جائے۔ اوہ۔ یہ اکتوبر کا مہینہ ہے۔ ۱۶ اکتوبر کو لیاقت علی خان شہید ہُوئے تھے۔ چلیں انہی پر لکھتے ہیں اداریہ۔ (کاغذ الٹنے پلٹنے کی آوازیں) وقت کم ہے۔ سیدھا سادا عنوان ہی رکھا جائے۔ شہیدِ ملت لیاقت علی خان۔"

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ایڈیٹر فون اٹھاتا ہے۔)

"ایڈیٹر بلال"۔

مسز بلال : (آواز کو لمبا کرتے ہُوئے) بلال ۔ جاؤ میں تم سے نہیں بولتی۔

ایڈیٹر : (حیرت سے) جی ای ای۔

مسز بلال : تم ناشتہ کر کے کیوں نہیں گئے۔ ابھی تک ناراض ہو مجھ سے؟

ایڈیٹر : (بوکھلائے ہُوئے انداز میں) جی . . . . وہ . . . . . . اصل میں مجھے جلدی تھی دفتر کی لیکن . . . . . .

مسز بلال : میں نہیں جانتی لیکن ویکن ـــــ تم فوراً گھر آؤ۔ ناشتہ کر کے جانا ـــــ

ایڈیٹر : جی! کون سے گھر آؤں ـــــ کیا پتہ ہے آپ کا؟

مسز : وہاٹ۔ کون بول رہے ہو؟

ایڈیٹر : جی میں ایڈیٹر ہلال بول رہا ہوں۔

مسز بلال : (غصّے سے) تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ ایسے ہی اتنی دیر سے وقت ضائع کر رہے ہو۔

(فون پٹخنے کی آواز۔ ایڈیٹر فون رکھتا ہے۔ اوراق الٹنے پلٹنے کی آوازیں)

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ایڈیٹر: "ہوں ـــــ شہیدِ ملت لیاقت علی خان ۔ (ٹھہر ٹھہر کر بولتا ہے۔)
قائدِ ملت لیاقت علی خان ہمارے ان رہنماؤں میں سے تھے جو.....
(فون کی گھنٹی پھر بجتی ہے ۔ فون اٹھاتا ہے۔)

مسز بلال: بھئی بلال ناشتہ کر جاؤ نا۔

ایڈیٹر: (ذرا سختی سے) دیکھیں محترمہ ۔ آپ مجھے یہیں بھجوا دیں ناشتہ ۔ اگر کرو الجھے میں گھر نہیں آسکتا۔

مسز بلال: (آواز کو لمبا کرکے حیرت سے) بلآل۔

ایڈیٹر: (نقل اتارتے ہوئے) جی نہیں ۔ ایڈیٹر ہلآل۔

مسز بلال: (جھنجھلاہٹ میں) افوہ ۔ آپ پھر ٹپک پڑے بیچ میں ۔
(فون بند کرنے کی آواز ۔ ایڈیٹر کاغذات سمیٹتا ہے)۔

ایڈیٹر: (خود کلامی) لاحول ولا قوۃ ـــــ جانے میں کیا لکھ رہا تھا ۔ کہاں چلا گیا وہ کاغذ ـــــ
(تیز تیز قدموں کی قریب آتی ہوئی آواز ـ دستک)

ملک شیر: میں اندر آسکتا ہوں سر!"

ایڈیٹر: آئیے ۔ (دروازہ کھلنے، بند ہونے کی آواز ۔ قدموں کی چاپ)

ملک شیر: سلام علیکم سر!

ایڈیٹر: وعلیکم السلام ـ خیریت؟

ملک شیر: (تیز تیز بولتا ہے) سر! بس کیا بتائیں، غضب ہوگیا۔

ایڈیٹر: کیا ہوگیا؟

ملک شیر: سر! وہ آپ نے تصویریں بھیجی ہیں بننے کے لیے ۔ ڈارک روم میں تو سارا کام ٹھپ ہوچکا ہے ۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے ۔

ایڈیٹر: (پُرسکون لہجے میں) بھئی بتائیں تو کیا ہوا؟

ملک شیر: سر کیا بتائیں آپ کو ۔ ہماری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ایڈیٹر: (غصے سے) بھئی بتائیں تو سہی کیا قیامت آگئی۔

ملک شیر: سر قیامت آجائے تو اچھا ہے ۔ ایک ہی بار بھگت لیں گے۔

ایڈیٹر: (ترشی سے، بلند آواز میں) کیا وقت ضائع کر رہے ہو ۔ کوئی بات ہو تو بتاؤ ورنہ چلے جاؤ یہاں سے ۔ مجھے اداریہ بھی مکمل کرنا ہے آج۔
(فون کی گھنٹی کی آواز ۔ اوورلیپ OVER LAP کرتی ہے ۔ ایڈیٹر فون اُٹھاتا ہے۔)

مسز بلال: (آواز کھینچ کر، پیار بھرے لہجے میں) بلآل۔

ایڈیٹر: (آواز بنا کر غصے میں) جی وہ کر گئے ہیں اِنتقال۔

مسز بلال: کون ہے؟ احمق!

ایڈیٹر: جی میں بول رہا ہوں ایڈیٹر ہلال
آپ یجیے نہ کوئی ملال

مسز بلال: اوہ ـــ یُو شٹ اَپ ـ بدتمیز۔
(فون بند کرنے کی آواز۔)

ایڈیٹر: جی ملک صاحب! کیا بات کر رہے تھے آپ؟

ملک شیر: سر! وہ میں عرض کر رہا تھا کہ ڈارک روم میں کام زیادہ ہوتا ہے ۔ آدمی ہم پہلے ہی کم ہیں ۔ اس پر مسئلہ یہ ہے کہ بجلی کبھی آتی ہے، کبھی چلی جاتی ہے......

ایڈیٹر: شیر صاحب! خدا کے لیے آپ چلے جائیں ۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں لکھ کر لائیں۔

ملک شیر: سر! لکھنا لکھانا تو آپ جیسے لوگوں کا کام ہے ۔ لیکن آپ سے پہلے جو ایڈیٹر تھے، انھیں ہم نے لکھ کر دیا تھا ۔ کوئی مداوا نہیں ہوسکا ۔ آپ کہیں گے تو آپ کو بھی لکھ کر دے دیں گے۔

ایڈیٹر: ہاں! ہاں! آپ جائیں لکھ کر لائیں۔
(فون کی گھنٹی اوورلیپ کرتی ہے ۔ ایڈیٹر فون اُٹھاتا ہے۔)

"ایڈیٹر ہلال۔"

سیمنٹ سٹور مین : جی وہ سیمنٹ کا ٹرک آگیا ہے۔ اب کیا حکم ہے ؟

ایڈیٹر : آپ نے کہاں فون کیا ہے ؟

سٹور مین : یہ ۶۴۲۶۵ ہے ؟

ایڈیٹر : نو ۔ رانگ نمبر۔ (فون رکھتا ہے)۔

ملک شیر: سر! وہ آپ کہہ رہے تھے کہ لکھ کر لاؤں۔

ایڈیٹر : ہاں ! ہاں ! جائیں ۔ آپ لکھ کر لائیں ۔

ملک شیر: سر وہ قلم تو آپ کے ہاتھ ہی میں سجتا ہے ۔ ہم تو مزدور آدمی ہیں۔

ایڈیٹر : (غصے سے) ملک صاحب ! یہ پیپر ویٹ دیکھ رہے ہیں آپ میرے ہاتھ میں۔

ملک شیر: (گھبرا کر) جی ! جی ! جی ۔

ایڈیٹر : یہ میں آپ کے سر پر دے ماروں گا۔ ورنہ چلے جائیں آپ۔

ملک شیر: سر! وہ مسئلہ جس کے لیے میں آیا تھا۔

ایڈیٹر : کیا مسئلہ تھا؟ ابھی تک منہ سے تو پھوٹے نہیں ہو۔

ملک شیر: سر! وہ ڈارک روم کا سیفٹی لائٹ بلب فیوز ہو گیا ہے ۔

ایڈیٹر : اُف اللہ ۔ (ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں) بھئی بلب ٹوٹ گیا ہے تو سٹور سے نیا لے لو۔

(فون کی گھنٹی اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ)

ایڈیٹر : (فون اُٹھاتے ہوئے) باہر بارش ہو رہی ہے ؟

ملک شیر: نہیں سر! ابھی تو صرف بادل آتے ہیں۔

(ایڈیٹر کی آواز اوور لیپ کرتی ہے۔)

ایڈیٹر : ایڈیٹر ہلال۔

سیمنٹ سٹور مین : سر وہ سیمنٹ کا ٹرک آگیا ہے ۔ میرے لیے کیا حکم ہے ؟

ایڈیٹر : (غصے سے) حکم کا بچہ۔ ٹرک آگیا ہے تو اَن لوڈ کر ڈالو۔

سٹور مین : لیکن سر۔ سٹور میں تو جگہ ہی نہیں ہے۔

ایڈیٹر : باہر ہی رکھوا لو۔

سٹور مین: سر وہ بادل آتے ہوئے ہیں۔ بارش ہو گئی تو سیمنٹ کا ستیاناس ہو جائے گا۔

ایڈیٹر : تم بکواس بند کرو۔ تمھارے باپ کا ہے سیمنٹ۔ جیسا بتایا ہے ویسا کرو۔

سٹور مین : ٹھیک ہے سر!

(ایڈیٹر فون رکھتا ہے۔ ملک شیر سے مخاطب ہوتا ہے)

ایڈیٹر : ملک شیر! تم گئے نہیں ابھی ۔ کہا تو ہے کہ سٹور سے نیا بلب لے لو۔

ملک شیر: سر وہ سٹور مین کہتا ہے کہ لکھ کر دو کہ پہلا بلب خراب ہو گیا ہے۔ نیا چاہیے ۔

ایڈیٹر : تو دے دو نا لکھ کر۔

ملک شیر: دیکھیں نا سر! یہ خواہ مخواہ کا پروسیجر۔ وقت ضائع ہوتا ہے اس میں۔

ایڈیٹر : لیکن آپ یہ میرا وقت کس خوشی میں ضائع کر رہے ہیں ؟

ملک شیر: سر وہ بلب چاہیے نا۔

ایڈیٹر : آئی سے گٹ آؤٹ ۔ (I SAY I GET OUT)

(قدموں کی دور ہوتی ہوئی آواز ___ بادلوں کی گڑگڑاہٹ۔ بارش کی ٹپ ٹپ)

ایڈیٹر : بارش شروع ہو گئی لیکن اداریہ ابھی تک مکمل نہیں ہو سکا۔ ابھی بریگیڈیر صاحب بلوالیں گے۔ آج آخری دن ہے کاپی جانے کا۔

(اوراق الٹنے پلٹنے کی آوازیں)

جانے میں کیا لکھ رہا تھا ___ ہاں . . . .

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔)

'ایڈیٹر ہلال'۔

صوبیدار علم دین : ۶۳۲۶۵

ایڈیٹر : جی ۔ ایڈیٹر ہلال۔

صوبیدار علم دین : دیکھیں جی میں دس بلوچ سے بول رہا ہوں صوبیدار علم دین۔ آپ کا پچھلے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہفتے کا ہلال نہیں ملا اب تک۔

ایڈیٹر : اوہو۔ ویری سوری۔ آپ ایسا کریں ۶۷۳۴۵ پر رِنگ کرلیں۔ وہاں بزنس منیجر ہوں گے۔ وہ بھجوادیں گے۔

صوبیدار: شکریہ سر!

(فون رکھنے کی آوازیں)

ایڈیٹر : اچھا تو میں لکھ رہا تھا...... کمال ہے پچھلے ہفتے کا ہلال ابھی تک پنڈی میں تقسیم نہیں ہوا۔ دوسرے شہروں کا کیا حال ہوگا۔ خیر.....

(تیز تیز قدموں کی قریب آتی ہوئی آواز۔ دستک)

چشتی : میں اندر آسکتا ہوں؟

ایڈیٹر : جی۔ آیئے۔ کون روک سکتا ہے آپ کو۔

(دروازہ کھلنے، بند ہونے کی آوازیں)

چشتی : سر وہ نزاکت کا بیٹا سلامت علی بیمار ہے۔ چھٹی مانگ رہا ہے۔

ایڈیٹر : چشتی صاحب! آپ ہیڈ کیلیگرافسٹ ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے مسئلے تو خود نبٹا لیا کریں۔

چشتی : سر! پہلے ہی دو کاتب چھٹی پر ہیں۔ اگر یہ بھی چلا گیا تو کام کون کرے گا۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی اور لیپ ہوتی ہے۔ ایڈیٹر فون اُٹھاتا ہے۔)

نسوانی آواز : کیوں جی! ہماری ٹکٹیں تو کنفرم ہیں نا!

ایڈیٹر : جی کیسی ٹکٹیں؟

نسوانی آواز : بھئی وہ کراچی تک کی۔ میری، نائلہ کی، شمائلہ کی اور عالیہ کی۔

ایڈیٹر : آپ کون بول رہی ہیں؟

نسوانی آواز : ارے آپ نے پہچانا نہیں۔ میں بول رہی ہوں عالمہ جہاں۔ ایم۔ اے۔

ایڈیٹر : آپ ایم اے ہیں؟

نسوانی آواز : کیوں ــــ یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ایڈیٹر : محترمہ آپ ایم اے ہیں۔ فون کرنے کے آداب آپ کو نہیں آتے۔ پوچھ تو لیا کریں۔ کہاں مِل گیا ہے آپ کا فون نمبر۔

عالمہ جہاں : آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟

ایڈیٹر : اب پوچھا تو کیا فائدہ؟ وقت تو ضائع کردیا آپ نے اتنا ــــ میں ایڈیٹر ہلال بول رہا ہوں۔

عالمہ جہاں : اوہ ــــ سوری۔ سوری رانگ نمبر

ایڈیٹر : (فون بند کرکے بڑبڑاتا ہے) سوری رانگ نمبر۔

جی چشتی صاحب! بھیج دیجیے نزاکت کو چھٹی پر۔ جائیں۔ مجھے کچھ لکھنے دیں۔ دیکھیں کاپی لیٹ ہوجائے گی۔

چشتی : سر! پھر وہ کام کون کرے گا۔

ایڈیٹر : (جھنجھلاکر) بھئی تو نہ بھیجیں اسے چھٹی۔ ایک آدھ دن ٹھہر کر چلا جائے گا۔

چشتی : لیکن اس کا بیٹا سلامت علی بیمار ہے۔

ایڈیٹر : (چلّاتے ہوئے) چشتی صاحب۔

(قدموں کی دُور ہوتی چاپ ــ دروازہ کھلتا ہے۔ چلا جاتا ہے۔)

دیکھیں اگر آج کی تاریخ میں مکمل ہوجائے یہ اداریہ۔

(اوراق اُلٹنے پلٹنے کی آواز۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے۔)

"ایڈیٹر ہلال"۔

برگیڈیر: (گمبھیر آواز میں) بھئی آج آخری دِن ہے۔ رسالہ پریس جانے کا۔ آپ نے کاپیاں نہیں دکھائیں اب تک۔

ایڈیٹر : (گھبرائے ہوئے لہجے میں) سر! کاپیاں مکمل ہیں۔ بس اداریہ رہ گیا ہے۔

برگیڈیر : پورا ایک ہفتہ ہوتا ہے آپ کے پاس۔ ایک اداریہ نہیں لکھا جاسکتا آپ سے۔ کیا کرتے رہتے ہیں آپ پورا ہفتہ۔

ایڈیٹر : سر! نہیں اداریہ تو لکھ لیا ہے۔ بس تھوڑا سا رہتا ہے۔

برگیڈیر: جو کچھ لکھا ہے، لے آئیں میرے پاس۔ فوراً۔
ایڈیٹر: اوہ ہو ——— (جلدی جلدی کاغذ سمیٹتا ہے، کرسی کی کھڑکھڑاہٹ
ٹائم گیپ میوزک) (TIME GAP MUSIC)

ایڈیٹر: MAY I COME IN SIR
برگیڈیر: YES
(قدموں کی چاپ)
ہاں بھئی، کہاں ہے اداریہ۔
ایڈیٹر: سر یہ رہا۔ ذرا جلدی میں لکھا ہے۔ چھوٹی موٹی غلطیاں ہوں گی شاید۔
برگیڈیر: لائیں دکھائیں۔ (آہستہ آہستہ پڑھتا ہے۔)
قائدِ ملت لیاقت علی خان ہمارے ان رہنماؤں میں سے تھے جو ناشتہ کیے بغیر دفتر چلے جاتے تھے۔ (حیرت سے) اچھا ——— !!!
انھوں نے بڑی محنت اور لگن سے قوم کی خدمت کی اور ملت کے افراد کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے۔ لیکن ڈارک روم کا سیفٹی لائٹ بلب فیوز ہوگیا۔ سٹورمین کا کہنا تھا کہ وہ کسی تحریر کے بغیر نیا بلب نہیں دے گا۔ یہ کیا ہے بھئی ——— ؟
ایڈیٹر: سر! وہ اصل میں !!
برگیڈیر: (پڑھتا ہے) ملت کی تعمیر میں افراد اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ متحد رہیں تو سیمنٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سیمنٹ ویسے بھی بارش میں بھیگ کر خراب ہوسکتا ہے۔ البتہ موسمی اثرات سے قائدِ ملت لیاقت علی کا بیٹا سلامت علی بیمار ہوجاتا ہے۔ ایک تو چھٹی نہیں ملتی دوسرے کراچی کی ٹکٹیں کنفرم نہیں ہوتیں ——
(ایڈیٹر کی گھبرائی گھبرائی آواز "سر! وہ، دراصل، یہ، اداریہ"۔

(کلوزنگ میوزک اور ریلیپ ہوتا ہے)

ان ساری مصروفیات کے باوجود جب ہمارے قلم میں روانی آگئی تو اکرام قریشی آئے۔ انھوں نے ہلال کی ادارت سنبھالی اور ہمیں رپورٹنگ پر لگا دیا گیا۔ رپورٹنگ کے شعبے میں ہم شہر شہر گھومے، طرح طرح کے لوگوں سے ملے، یونٹ کمانڈروں سے لے کر سربراہِ مملکت تک اور عام سپاہیوں سے لے کر جرنیلوں تک۔ چھوٹے رینک میں بڑے لوگ دیکھے، بڑے رینک میں چھوٹے۔ افسروں میں زاہدانِ شب بیدار بھی ملے، رندانِ میخوار بھی۔ پیار، محبت اور حسنِ سیرت کی مسکراتی تصویریں بھی اور نخوت و غرور میں مبتلا نفرت کی تعبیریں بھی۔ زندگی دکھوں کا گھر ہے، زیب نہیں دیتا کہ اشرف المخلوقات چہرے پر نفرت کی شکنیں لیے الجھنوں کو عام کرتا پھرے۔ پیار سے ملنا، مسکرا کے ملنا، نیکی ہے اور نیکی کر گزرنی چاہیے کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، شاید کہ کبھی کام آجائے۔

لیکن خطا بھی انسان ہی سے ہوتی ہے اور رنگ بھی لاتی ہے۔ ہم آئی ایس پی آر میں تھے جب ہمیں ماضی کی یادوں نے ورغلایا۔ فوج میں آنے سے پہلے ہم راولپنڈی میں ایک نیوز ایجنسی میں رپورٹر تھے۔ اتنے دنوں کی فوجی زندگی کے بعد واپس راولپنڈی آئے تو نرم و حسین دلگداز زندگی بڑی اچھی لگی۔ شہر کے شب و روز بھی — پرانے دوستوں سے ملے، گئی یادوں کو تازہ کیا۔ اور اسی دوران میں کبھی کسی پریس کانفرنس میں جا نکلے، کبھی کسی جلسہ گاہ میں کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

وردی پہننے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو ہم ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتے تھے۔ جی ایچ کیو نے ہمیں ان حرکتوں اور آوارہ گردیوں میں مصروف دیکھا تو یکایک آئی ایس پی آر سے نکال کر شمالی علاقوں میں دے مارا۔ یہ الگ بات کہ

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی

ہم ایک تحصیلدار ہیڈکوارٹر کے قریب قیام پذیر تھے۔ تحصیلدار ٹرانسفر پر جا رہا ہے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

تھے۔ ان کے اعزاز میں الوداعی پارٹی تھی۔ فوج کی طرف سے بریگیڈ کمانڈر مدعو تھے۔ انھوں نے ہمیں اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیا۔ ہم وہاں ایک عدد تقریر جھاڑ آئے۔ کمانڈر نے سُنا تو سر پیٹ لیا۔ انٹیلی جنس والوں نے پھر رپورٹ کر دی۔ کہ فوجی افسر سِول جلسے سے خطاب فرما آئے ہیں۔ لیکن اب ہمیں بارڈر تو کراس نہیں کروایا جا سکتا تھا۔

یہ تو تھی ایک سخن گسترانہ بات جو صحافت کے حوالے سے چلی تھی۔ آئیے آپ کو کوچۂ صحافت میں لے چلیں کہ ہم اسی راستے فوج میں نازل ہوئے۔

۳۔ بحوالۂ صحافت

صاحبو!

فوج میں ہم سے اکثر سوال کیا جاتا ہے:

"آپ کس مضمون میں ایم اے ہیں؟"

"جرنل اِزم میں" ہم جواب دیتے ہیں۔

فوجی ماحول میں ایک تو جرنل اِزم ویسے ہی نیا نیا سا نام لگتا ہے، دُوسرے اس کے صوتی اثرات جنرل اِزم سے خاصے مِلتے جلتے ہیں۔ اچھے بھلے لوگ امپریس ہو جاتے ہیں بات محض امپریس ہونے تک محدود رہتی تو خیریت تھی۔ بہت سے لوگ بہت سے ضمنی سوال بھی کر بیٹھتے ہیں۔

"یہ کیا ہوتا ہے جرنل ازم بھئی؟"

"کیا پڑھاتے ہیں آپ کو؟"

"کیا کرتے رہے آپ کوچۂ صحافت میں؟"

پہلا سوال جنرل نالج کا ہے جس کا جواب ہر شریف آدمی کو آنا چاہیے۔ دوسرا سوال پڑھانے والوں سے متعلق ہے پڑھنے والوں سے نہیں۔ ہم شعبۂ صحافت میں پڑھنے والوں میں سے تھے۔ اور آج کل پڑھنے والوں کا کام محض پڑھنا نہیں ہوتا۔

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں "پڑھائی" کے سوا

ہاں تیسرا سوال چونکہ خالص ہماری اپنی حرکتوں سے متعلق ہے اس کا جواب ہمارے ذمے رہا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ما قِصّہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

فوج میں نزول سے پہلے ہم صحرائے صحافت کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ اس دشت نوردی کی پہلی ذمّہ داری تو جامعہ پنجاب کے شعبۂ صحافت پر عائد ہوتی ہے جہاں سے ہمیں ایم اے کی ڈگری جاری کی گئی، دُوسری ذِمّہ داری ان دوستوں پر عائد ہوتی ہے جو گرچہ صحافت کے طالب علم نہیں تھے لیکن صحافیانہ عادات و اطوار پختہ کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ آپ پوچھیں گے یہ صحافیانہ عادات کیا ہوتی ہیں۔ سُنیئے :

پکے صحافیوں کی ایک نشانی یہ ہے کہ ان کے دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ رات جُوں جُوں جوان ہوتی جاتی ہے۔ ان کی مصروفیت بڑھتی جاتی ہے۔ رات کے پچھلے پہران کی مصروفیات ختم ہوتی ہیں۔ سحر کے اُجالے ان کی آنکھوں میں ٹوٹتی نیند دل کا خمار پاتے ہیں اور جب لوگ اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہوتے ہیں تو صحافی خواتین و حضرات لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ صبح کے وقت آپ اخبار کے کسی دفتر میں جانکلیں تو یہی لگے گا جیسے کسی اُجڑی سہاگن کے گھر آگئے۔ کمرے بھائیں بھائیں کر رہے ہوں گے، کرسیاں بے ترتیب، میزیں خالی۔ جا بجا کاغذوں کے ڈھیر۔ کوئی کارندہ ملے گا بھی تو اونگھتا ہُوا۔ نصف النہار کے قریب اِکا دُکا لوگ آنا شروع ہوتے ہیں۔ میزیں سجتی ہیں۔ قلمدان جمائے جاتے ہیں، کاغذات ترتیب دِیے جاتے ہیں ٹیلی پرنٹر بھی بیدار ہو کر ٹِک ٹِک شروع کر دیتے ہیں۔ شام ہوتے ہوتے اس بازار کی ساری رونقیں لوٹ آتی ہیں، پھر جُوں جُوں رات جوان ہوتی جاتی ہے نیوز رُوم کے ہنگامے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آدھی رات کے بعد کاروبار اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اور سحر کے اجالے پھیلنے سے پہلے نیوز روم میں کام کرتے صحافی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

اِس سے پہلے کہ آپ کا ذہن کہیں اور جا اُلجھے ہم اس کی تشریح کیے دیتے ہیں :

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

صحافیوں کے رتجگوں کی پہلی ذمہ داری تو آپ پر یعنی قارئین پر عائد ہوتی ہے جو اخبار پڑھیں نہ پڑھیں فیشن کے طور پہ ناشتے کی میز پر اس کا ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ بس اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اخبار کی ترتیب و تزئین اس طرح سے کی جاتی ہے کہ صبح کے دھندلکے چھٹنے سے پہلے اخبار آپ تک پہنچ جائے پھر چونکہ مال تازہ دینا ہوتا ہے اِس لیے تمام رات کام کرنا پڑتا ہے۔ اِدھر اخبار تیار ہوتا ہے اُدھر آپ کا ہاکر دروازے پر دستک دے رہا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں صحافیوں کی شب بیداری کی ایک بڑی وجہ بین الاقوامی ایجنسیاں بھی ہیں۔ جب ہمارے ہاں دن ہوتا ہے تو مغربی اور یورپی ممالک اونگھ رہے ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی خبر گھر یعنی اقوامِ متحدہ، ناسا، ای ای سی اور بی بی سی وغیرہ بھی انہی خطوں میں واقع ہیں اور خبری شخصیات از قسمِ الزبتھ ٹیلر، لیڈی ڈیانہ، جین فنڈا، رنگین وغیرہ بھی انہی علاقوں سے متعلق ہیں۔ جب یہ لوگ آنکھیں ملتے بیدار ہوتے ہیں تو ہمارے ہاں رات ہو چکی ہوتی ہے۔ تب ہمارے صحافی قلم ہاتھ میں لیے ان کی مسکراہٹوں، دھمکیوں یا پیشین گوئیوں کا انتظار کرتے ہیں اور جب کوئی خبر معرضِ وجود میں آجائے تو اسے اخبار کی پیشانی پر سجا کر آپ کے حضور پیش کر دیتے ہیں۔

اخباروں کا نیوز ڈیسک ٹیلی پرنٹروں کے ذریعے تمام دُنیا سے مِلا ہوتا ہے اور ان ٹیلی پرنٹروں کی باقاعدہ ٹِک ٹِک شام کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے تو ایک چھوٹا بھورا لومڑ ہی ایک اونگھتے کتے پر سے کودتا پھاندتا رہتا ہے ★ پھر چشم بد دُور ہمارا پولیس کا شعبہ ہے۔ کریمنل رپورٹرز (جنھیں کرائمز رپورٹرز بھی کہا جاتا ہے) سُورج چھپنے کے بعد ہی مختلف تھانوں سے رابطہ پیدا کرتے ہیں

★ اشارہ ہے ٹیلی پرنٹر آپریٹروں کی طرف جو بطور مشق یہ جملہ ٹائپ کرتے رہتے ہیں۔

THE QUICK BROWN FOX JUMPS OVER THE LAZY DOG

اِس جملے میں انگریزی ہجوں کے تمام لفظ آجاتے ہیں۔

اور ان کی دن بھر کی کارکردگی سے خبریں برآمد کرتے ہیں۔

دن دہاڑے کوئی بنک لُٹ جائے، قتل ہو جائے، کسی اداکارہ کے گھر ڈکیتی کی واردات ہو جائے تو رپورٹر کو خاصی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ اسے سارا دن خبر کا تعاقب کرنا پڑتا ہے مبادا فائرنگ میں مرنے والوں کی تعداد تین سے بڑھ کر پانچ ہو جائے یا پانچویں کے بعد چھٹا بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دے۔ ویسے تو رپورٹر خبر بنا کر عادتاً آخر میں لکھ دیتے ہیں، "پولیس نے مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔ ملزم تاحال مفرور ہیں۔" لیکن خبر کو آخر وقت تک روک کر رکھا جاتا ہے۔ مبادا ملزم گرفتار ہی نہ ہو جائیں۔ تب خبر کا پُورا حُلیہ ہی بدل جاتا ہے۔

ثابت یہ ہُوا کہ اچھا صحافی بننے کے لیے رتجگوں کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ اب شعبۂ صحافت میں تو اس تربیت کا اہتمام ہونے سے رہا کہ وہاں بھولے بھالے چہرے بھی صحافت کا علم حاصل کرنے آتے ہیں۔ ماحول بھی بہت سبک، خُوشگوار اور دھیما دھیما ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خُورشید ان دنوں شعبے کے سربراہ تھے۔ تاریخِ صحافت پڑھانے کے علاوہ بین الاقوامی امور سے بھی روشناس کرایا کرتے تھے لیکن جانے کیوں ایک بہترین صحافی ہونے کے باوجود انھیں ہمارے رتجگے اور لاأبالی پن ایک آنکھ نہ بھاتا۔ جو ساری رات جاگے گا صبح پہلے پیریڈ میں لامحالہ تاخیر سے پہنچے گا۔ وہ پہلا پیریڈ لیا کرتے تھے اور تاخیر سے آنے والوں کا داخلہ ان کی کلاس میں بند تھا ـــ ہم ان کے فیض سے محروم ہی رہ گئے بلکہ ہماری آوارہ گردیوں کے نلطے ہمارا کردار بھی ان کی نظروں میں مشکوک ٹھہرا کہ ایک اچھا بھلا سکالرشپ جو امتیازی نمبروں کی وجہ سے ہمارے حِصّے میں آرہا تھا ایک لڑکی کے حوالے کر دیا گیا جس کے نمبر گرچہ ہم سے کم تھے لیکن کردار میں وہ ہم سے بہتر ٹھہری۔ ایک تو یہ لڑکی خود بڑی کومل اور پیاری تھی دوسرے سکالرشپ ملنے پر اس نے خود ہم سے اظہارِ ندامت کیا تو ہم احتجاج کے حق سے بھی دستبردار ہو گئے۔

دھیمی دھیمی شخصیت کے مالک پروفیسر سکین حجازی ہمیں خبریں بنانا سکھایا کرتے تھے۔ مسکراتے مسکراتے انھوں نے ہمیں خبروں کے ماخذ بتائے۔ خبروں کو ترتیب دینا بتایا اور خبریت کے عناصر پوری شرح و بسط سے بیان کیے۔ ہم ان کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ہمیشہ ہمیں اپنے اچھے شاگردوں میں سے جانا ـــ فاصلوں کی خلیج بڑھنے کے باوجود انھوں نے ہمیں اپنے اعتماد کے قابل جانا ـــ آج کل ہم جو کچھ بھی ہیں اس میں سکین حجازی صاحب کے پیار کا بڑا حصّہ ہے۔

پروفیسر وارث میر صاحب نے ہمیں کالم نویسی سکھائی۔ احتیاط سے اداریے لکھنے کے ڈھنگ اور "گریبان کھول کر" مذاکرات کرنے کے گُر سکھائے۔ واضح رہے کہ اس وقت تک وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لندن نہیں گئے تھے۔ اب تو ان سے بذریعہ اخبارات ہی ملاقات رہتی ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔

مہدی حسن صاحب ہمیں ابلاغِ عامہ کا مضمون پڑھایا کرتے۔ ان کی ٹھہری ٹھہری طبیعت اور انتہائی غُصّے کے عالم میں بھی پُرسکون لہجے کا اِختیار کیے رہنا پسند آیا۔ جو شخص غصّے کے عالم میں خود پر قابُو رکھتا ہے اور منطق کی بات کرتا ہے اس میں بڑے آدمی ہونے کی واضح علامت ملتی ہے۔ مہدی حسن بڑے آدمی تھے۔

یہ تو تھے وہ حضرات جو ہمیں پڑھانے پر مامور تھے۔ تھیوری پڑھانے پر ـــ "پریکٹیکل" کے پیریڈ ان "لفنٹروں" کے ذمے تھے جو وقت کا سرمایہ تھے۔

محمد یونس آف منڈی بہاءالدین ـــ ناٹے سے قد کا خُوبصورت آدمی۔ صحافت کا طالب علم۔ صلاحیتیں جس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں لیکن بنیادی طور پر جاہل آدمی ثابت ہُوا کہ دوستوں کے اصرار کے باوجود شہر چھوڑ کر گاؤں جا بیٹھا ـــ ایم اے صحافت کر کے لُٹیا ڈبو دی ـــ سنا ہے آج کل کپڑے کا کاروبار کرتا ہے۔ (ایم اے صحافت کرنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ) کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا لیکن تھا تو صحافی ـــ گھر سے آنے والے تمام پیسے ابتدائی تاریخوں میں اجاڑ دیتا ـــ ایک دفعہ ایک ایک آنہ چندہ جمع کرتا پایا گیا۔ پوچھنے پر معلوم ہُوا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کہ تکے کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ ٹکوں کے پیسے تو جمع ہو گئے لیکن انار کلی جانے کا کرایہ نہ بن پا رہا تھا ـــــ دھن کا پکا، ایک اور طالب علم کو ساتھ لیا اور یونیورسٹی سے پیدل انار کلی پہنچا، تکے کھا کر ہی دم لیا۔

یہ حرکت آپ کو شاید انوکھی لگے۔ لیکن یونیورسٹی بھری پڑی تھی ایسی نادرِ زمانہ اشیاء سے ـــــ سجاد نیازی طارق مصطفےٰ کے ساتھ مل کر آدھی رات کو یونیورسٹی نیو کیمپس سے پیدل چل کر بھاٹی گیٹ یا گوالمنڈی محض لسی نوش فرمانے جایا کرتے تھے۔ سجاد نیازی کا ایک اور اصول اٹل تھا۔ کتنی ہی دیر سے سو کر اٹھیں۔ پیریڈمِس ہو سکتے تھے، دیگر سرگرمیاں مؤخر کی جا سکتی تھیں لیکن ناشتہ ساقط نہیں کرتے تھے۔ کسی دن اتنی دیر سے اُٹھے کہ سُورج سر پر آ گیا۔ آدھے دن سے کسی ہوٹل میں پہنچے، کسی نے تجویز دی کہ اب کھانا ہی کھائے لیتے ہیں تو گھنٹوں بحث کر سکتے تھے کہ جو چیز پہلے ہونی ہے پہلے ہو گی ـــــ پہلے ناشتہ پھر کھانا ـــــ یوں بھی ہوا کہ یار لوگ انتظار کرتے رہے، نیازی صاحب نے بند مکھن تناول فرمایا، چائے کا ایک کپ نوشِ جاں کیا، پھر حکم ہوا، ہو جائے لنچ بھی ـــــ

عبدالوحید سلیمانی ـــــ ہر سربراہِ مملکت کے ناشتے کی تفصیلات بہم رکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا ـــــ ان کے والد پاک و ہند کے بڑے زبردست حکیم تھے ـــــ ایم۔اے کرنے کے بعد انھوں نے والد صاحب کی کتابیں چھاپنا شروع کیں۔ پھر شاید پڑھنے بھی لگے۔ چونکہ آج کل خود بھی حکمت کی راہوں پہ چل نکلے ہیں۔ اب ان سے ملنے جائیں تو ان کے مریض تنہائی میں ان سے راز و نیاز میں مصروف ملتے ہیں۔ جنٹلمین بسم اللہ چھاپنے کی حرکت بھی انہی کی تھی۔ زیرِ نظر کتاب بھی انہی صاحب نے شائع کی ہے۔ پسند نہ آ رہی ہو تو صلواتیں انہی کو سنائیے گا۔ بڑے کشادہ دل واقع ہوئے ہیں۔

محمد صدیق ـــــ نور جہاں کے گاؤں کا تھا۔ لکھتا تو موتی پروتا، بولتا تو فصاحتوں کو نئے معانی ملتے۔ یونیورسٹی یونین کا صدارتی الیکشن لڑتے لڑتے رہ گیا۔

غمِ روزگار نے اس کو نکما کر دیا۔

رمضان عادل۔ آج کل راولپنڈی یونین آف جرنلسٹس کے صدر ہیں۔ مخلص، وفاکیش، اونچی آواز میں ہوتی ریکارڈنگ والے ہوٹل میں بیٹھ کر ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے۔ (شاید اس لیے کہ ہم تلفظ کی غلطیاں نہ نوٹ کر سکیں)

زاہد بخاری، نسیم انصاری اور ہم ـــــ اِتحادِ ثلاثہ کے نام سے مشہور تھے۔ زاہد بلا کے مقرر تھے۔ اُردو کے بھی پنجابی کے بھی۔ فی البدیہہ تقریر کرنے میں کمال کا ملکہ حاصل تھا۔ ایک دن ہم سُورج ڈھلے ہیلی کالج کے سٹاپ پر کھڑے تھے۔ غالباً یونیورسٹی جانا تھا۔ کالج کے اندر سے شور سنائی دیا۔ جھانک کر دیکھا، معلوم ہوا پنجابی کا کوئی مباحثہ برپا ہے اور مقررین کی زبردست ہوٹنگ ہو رہی ہے۔ ہم نے بھی نشستیں سنبھال لیں ـــــ پتہ چلا گورنمنٹ کالج سے کوئی ٹیم نہیں آئی ہوئی ـــــ زاہد بخاری کا نام گورنمنٹ کالج کے نمائندے کے طور پر سٹیج سیکرٹری کو بھیج دیا گیا۔ انھیں بلا لیا گیا۔ تقریر ہوئی اور بڑے دھڑلے کی تقریر ہوئی۔ کچھ دیر بعد ہم پھر بس شاپ پر کھڑے تھے۔ مباحثے کے دُوسرے انعام کا کپ زاہد نے سنبھال رکھا تھا۔ بعد میں وہ کراچی یونیورسٹی یونین کے صدر بھی رہے۔ آج کل اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گئے ہوئے ہیں۔

دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے اور چھوٹے چھوٹے واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ ـــــ موتیوں کی ایک مالا ـــــ جس کا ایک ایک موتی سچا تھا۔ مالا ٹوٹی۔ موتی بکھر گئے۔ وقت کی آندھیوں نے کتنے موتیوں کو گرد آلود کر دیا۔

اِس گروپ کے ساتھ مِل کر ہم نے دوستیاں بھی نبھائیں اور دُشمنیاں بھی مول لیں۔ مشکلات میں خدا کی رضا پر قانع ہو کر مسکرانا اور خوشیوں میں آپے سے باہر نہ ہونا سیکھا۔ غلطیوں کے اعتراف میں بڑی عظمت ہے لیکن اس اعتراف کے لیے بڑا مضبوط جگر چاہیے۔ یہ بات سیکھنے سے آتی ہے۔ وہ حدیث کئی دفعہ پڑھی ہو گی کہ اگر تم روزے سے ہو اور کوئی تم سے گالی گلوچ پر اُتر آئے تو کہہ دو کہ میں روزے سے ہوں ـــــ نفرتوں کے

اس ماحول میں جہاں ہر طرف اینٹ کا جواب پتھر سمجھا ہو اس پر عمل کرنا فرہاد کو مات کرنا ہے، لیکن ہم نے صدیق کو دیکھا کہ اس کا پڑوسی کف اڑاتا گالیوں کا طومار باندھ رہا ہے۔ منحنی سا لڑکا۔ صدیق چاہتے تو روئی کی طرح دھنک دیتے لیکن بولے، "میں دُنے سے ہوں۔ تمہیں جواب نہیں دے سکتا"۔ پھر خاموشی اختیار کیے رکھی۔

بہت کم لوگوں کو ایسی رفاقتیں میسر آتی ہیں جو بھلے دنوں کی نہیں، دُکھ درد کی بھی شریک ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک دُوسرے کے لیے جگمگاتی شعلیں ہوں! ایک تھک کر چُور ہُوا، دُوسرے نے ہاتھ تھام لیا۔ دُوسرا ڈگمگایا تو تیسرے نے سہارا دیا۔ اِنسانی زندگی محبت کے انہی جذبوں سے عبارت ہے۔ محبتیں جیسی بھی ہوں رنگ لاتی ہیں، کچھ محبتیں تو وہ ہوتی ہیں کہ جن کا اظہار بھی نہیں ہو پاتا۔ آدمی اندر ہی اندر دھیمی آگ پر رکھے دُودھ کی طرح اونٹتا رہتا ہے۔ اس کی سطح پر اُبال آتا ہے نہ جوش کی کوئی کیفیت۔ بس اس کے اندر کی خُودی اُوپر آ آ کر ایک جھلّی سی بنتی رہتی ہے اور وہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنی خُودی کا لُعاب اپنے اِردگرد لپیٹتا رہتا ہے کسی سے کچھ کہتا ہے، نا سنتا ہے۔ کچھ محبتیں پھُولوں کی طرح ہوتی ہیں خاموش خاموش، لیکن ان کی مہک ان کے ہونے کی پہچان ہوتی ہے۔ اور کچھ لپکتے شعلوں کی طرح کہ ان میں جلنے والے خود بھی جلتے ہیں اور ان کے قریب رہنے والے بھی یہ تپش محسوس کرتے ہیں — اظہار کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ کچھ محبتوں میں ندی کی لہروں کی سی روانی ہوتی ہے اور کچھ میں میدانی دریاؤں کی سی طغیانی۔ کچھ ٹوٹنے والے تاروں کی طرح ہوتی ہیں، آناً فاناً چمک کر فنا ہو جانے والی محبتیں، اور کچھ قطبی ستاروں کی سی پائیدار، مستقل، راہ دکھانے والی محبتیں، اندھیروں میں روشنی بن کر جگمگانے والی، کچھ محبتیں آبشاروں کی طرح ہوتی ہیں کہ جب نچھاور ہوتی ہیں تو شور مچاتی، دندناتی ہُوئی اور کچھ دُور پربتوں کے دامن سے پھُوٹنے والے جھرنوں کی طرح، ٹھنڈی، میٹھی، دھیمی دھیمی، شفاف محبتیں۔ محبتیں جینے کا عزم عطا کرتی ہیں۔

ترا عشق تھا جو غبار بن کے قدم قدم میرے ساتھ تھا
تری خواہشوں کا دِیا بُجھا تو نگر نگر ہے دُھواں دُھواں

بات صحافت کی ہو رہی تھی۔ ایم اے صحافت کے آخری اِمتحان سے بہت پہلے کی بات ہے ہمیں بتایا گیا کہ ایم اے کرنے کے بعد گریڈ یعنی باقاعدہ صحافی کی تنخواہ لینے کے لیے کم از کم چھ ماہ اپرنٹس کے طور پر کام کرنا ضروری ہے۔ سوچا کیوں نہ ایم اے کرنے سے پہلے ہی یہ تربیت حاصل کر لی جائے کہ ایم اے کرنے کے بعد ایک سو سینتیس روپے پچاس پیسے کی تنخواہ پر کام کرنا تو ڈگری کی توہین ہو گی چنانچہ روزنامہ ندائے ملت سے رجوع کیا۔

اس روزنامے کا اجرا جناب مجید نظامی نے کیا تھا نوائے وقت کے بانی حمید نظامی کے بھائی ہیں۔ بعض وجوہ کی بنا پر انھوں نے نوائے وقت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور نوائے وقت ان کے بھتیجوں کے ہاتھوں میں رہ گیا تھا۔ بعدازاں جب چچا بھتیجے گلے مِلے تو دونوں اخباروں کا بھی ملاپ ہو گیا۔ ندائے ملت نوائے وقت میں ضم کر دیا گیا، البتہ فالتو کارکنان کی چھانٹی ہو گئی — "غیر سیاسی باتیں" لکھنے والے عبدالقادر حسن ان دِنوں ندائے ملت کے چیف رپورٹر تھے اور "روزنِ دیوار" سے تاک جھانک کرنے والے عطاء الحق قاسمی بھی ندائے ملت سے وابستہ تھے۔ بعدازاں وہ اپنا نیا موٹر سائیکل اٹھارہ سو روپے میں بیچ کر امریکہ روانہ ہو گئے — یہ تو تھے دوسرے سیکشنوں کے لوگ۔ ہمارا پہلا واسطہ پڑا وحید قیصر سے جو ڈیسک انچارج تھے۔ پہلے دن جب ہم ندائے ملت پہنچے اور اخبار میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے تین چار سطروں کی ایک سلپ ہماری طرف بڑھائی اور کہا کہ یہ خبر بناؤ۔ یہ پی پی آئی کی کریڈ یعنی ٹیلی پرنٹر پر آنے والی ایک خبر تھی جسے ہم نے اُردو کے قالب میں ڈھالنا تھا۔ ہم نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس پر انگریزی زبان میں کچھ لکھا تھا۔ کیا؟ ہماری جانے بلا — یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں ایک ٹیلی پرنٹر موجود تو تھا اور اس پر سارے دن خبریں ٹِک ٹِک ہوتی بھی رہتی تھیں لیکن انھیں دیکھنے کی فرصت کسے ملتی تھی — بہت ہُوا تو یہ کہ رَف کاغذ کی ضرورت پڑی تو ٹیلی پرنٹر سے کریڈ پھاڑی اور خبروں کی دُوسری طرف والا حِصّہ کچھ لکھنے لکھانے کے لیے اِستعمال کر لیا — یا یہ کہ کیفے ٹیریا سے سموسے یا پیسٹریاں منگوائی گئیں تو خالی میزوں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

پر رکھنے کی بجائے ٹیلی پرنٹر سے کریڈ پھاڑی اور میزوں پر بچھا کر ان پر یہ چیزیں سجادی گئیں۔ عملی زندگی کے پہلے دن خبر بنانے سے پالا پڑا تو سٹی گم ہوگئی۔ بے کسی سے ہم کبھی خبر کو دیکھتے کبھی وحید قیصر کو ـــــ پندرہ بیس منٹ اسی شش و پنج میں گزر گئے۔ اس دوران ہمارے دائیں بائیں بیٹھے سب ایڈیٹر دھڑا دھڑ خبریں بناتے رہے ـــــ ہم ایک نظر اپنی خبر کو دیکھتے۔ پھر دائیں بائیں نگاہ ڈالتے اور پھر اس پر جھک جاتے ـــ اس پر ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے علاوہ دو ایک جگہ RPTD کے لفظ لکھے تھے۔ یہ REPEATED کا مخفف ہے اور ٹیلی پرنٹر اپریٹر سے کوئی غلطی ہوجائے تو وہ یہ لفظ ٹائپ کرکے پُورا فقرہ یا وہ لفظ دوبارہ ٹائپ کرتا ہے۔ لیکن ہم نے پہلی مرتبہ یہ لفظ دیکھا، اس کے ساتھ خبر فلسطینی جدوجہد کے کسی واقعے سے متعلق تھی جس میں کوئی دھماکہ ہوا تھا، کوئی لڑکی زخمی ہوگئی تھی یا جانے اسی نے دھماکہ کیا تھا ـــــ ریلوے لائن کا بھی ذکر تھا اور کسی گارڈی واڑی کا بھی ـــــ کچھ ٹھیک سے سمجھ نہیں آرہا تھا اصل واقعہ کیا تھا۔ بالآخر جیسے امتحانوں میں خالی جگہیں پُر کرنے والا سوال حل کرتے ہیں ہم نے سوال حل کرلیا ـــ جس لفظ کا مطلب سمجھ میں آیا اس کا ترجمہ کردیا جہاں نہ سمجھ آیا وہاں اپنی عقل کے مطابق خالی جگہ سمجھ کر پُر کردی ـــ خبر بناکر وحید قیصر صاحب کے ہاتھ میں تھمادی ـــــ انھوں نے ایک سیکنڈ لگایا ہوگا اسے دیکھنے میں۔ اس سے کہیں زیادہ وقت وہ ہمیں گھورتے رہے۔ ہم نے نگاہیں جھکالیں۔ بولے :

"ایم اے کررہے ہیں آپ صحافت میں؟"

"جی!"

"گریجویشن کرچکے ہیں آپ؟"

"جی۔"

"یعنی آپ بی اے کرچکے ہیں۔ چودہ جماعتیں پاس ہیں؟"

"جی ہاں! فرسٹ ڈویژن میں۔"

ہم نے بڑے فخر سے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں انھیں بتایا کہ شاید ان پر کوئی اثر ہو لیکن وہ اسی طرح ہماری بنائی ہوئی خبر ہاتھ میں لہراتے ہُوئے سپاٹ لہجے میں بولے :

"یہ کیا ہے؟"

"خبر!"

ان کے چہرے پر ایسے تاثرات اُبھرے جیسے کسی نے چھُرا گھونپ دیا ہو۔ ہم نے "خبر" کی شان میں کوئی زبردست گستاخی کردی تھی۔ بس چلتا تو پیپر ویٹ اٹھا کر ہمارا سر پھاڑ دیتے لیکن کہتے ہیں تعلیم اور اولاد انسان کو بُزدل بنادیتی ہے۔ وحید قیصر پڑھے لکھے بھی تھے 'صاحبِ اولاد' بھی۔ انھوں نے تھُوک نگلا۔ "خبر" کو ردی کی ٹوکری میں ٹھونسا اور بولے :

"آپ تشریف لے جائیں۔ ہمارے پاس جگہ نہیں ہے۔"

اور ہم پر گھڑوں پانی پڑ گیا ـــ سارا فخر و انبساط آبی بخارات بن کر اُڑ گیا۔ اس وقت زمین پھٹ جاتی تو ہم بخوشی اس میں سما جاتے۔ سر جھکائے بیٹھے رہے، خُون کی ساری گردش دماغ کی طرف تھی۔ چہرہ تپ رہا تھا اور کان کی لویں جل رہی تھیں۔

"محترم عرض کیا نا۔ تشریف لے جائیں۔ ہمارے پاس بالکل جگہ نہیں ہے۔"

وحید قیصر صاحب کی آواز پھر سنائی دی۔

سوال یہ تھا ہم تشریف لے کر جاتے کہاں؟ جو وقت آوارہ گردیوں کی صورت میں ضائع کیا تھا وہ بے غیرتی کا غبار بن کر قدم قدم ہمارے ساتھ چلتا اور ہر جگہ ہمیں شرمندہ کرتا ـــــ بڑے ٹھنڈے دل سے ان لمحات میں ہم نے فضولیات کو خیرباد کہا اور وحید قیصر سے درخواست کی۔

"سر! مجھے نوکری نہیں چاہیے۔ میں کچھ سیکھنے آیا ہوں۔"

"نہیں بابا نہیں۔ ہمیں فرصت ہی نہیں کسی کو کچھ سکھانے کی۔ دُوسرے یہ کہ ڈاکٹر عبدالسلام خُورشید آپ کو کچھ نہیں سکھا سکے۔ تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔"

وہ جس بھی کھیت کی مولی تھے۔ ہمارے جُملہ امراض کی شفا اب انہی کے ہاتھ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

تھی۔ ہم ڈٹے رہے۔ وحید قیصر پھر ایسے مصروف ہوئے کہ نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ گیارہ بجے کے قریب جب بیٹھے بیٹھے جمائیاں آنے لگیں تو ہم اُٹھ آئے۔ دوسرے دن پھر پہنچ گئے۔ کوئی لِفٹ نہ ملی۔ نصف شب کے قریب ہم لوٹ آئے۔

تیسرے دن گئے تو دیکھا کہ نیوز ڈیسک پر کوئی کرسی خالی نہیں ہے۔ وحید قیصر صاحب کی طرف دیکھا، وہ سر جھکائے مصروف تھے۔ ہم نے سر کھجایا اور سیدھے ایڈیٹر جناب مجید نظامی کے کمرے میں گھُس گئے۔ جاتے جاتے دروازے پر ٹھہر کر وحید قیصر کی طرف مُڑ کر دیکھا تو ان کی حیران حیران نظریں تعاقب میں پائیں۔ کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا اور بولے "سر۔ وحید قیصر صاحب نے ایک کرسی منگوائی ہے۔" انھوں نے اثبات میں اشارہ کیا۔ ہم کرسی لائے۔ عبدالنصیر غوری صاحب سب ایڈیٹر تھے۔ بعد میں مسلح افواج کے ہفت روزہ ہلال کے ایڈیٹر بنے۔ ان سے درخواست کی کہ ذرا ہمارے لیے جگہ بنائیں، انھوں نے کرسی کھسکائی۔ ہم نے اپنی کرسی فِٹ کی اور براجمان ہو گئے۔ وحید قیصر نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور آتی ہوئی مسکراہٹ کو دبا گئے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد انھوں نے ہمیں قریب بلایا اور بتایا کہ نوکری ملنی بہت مشکل ہے۔ کیوں وقت ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہو ——

ہم نے صاف صاف انھیں بتایا کہ انھوں نے بھرے ڈیسک کے سامنے ہماری "بے عزّتی" کی تھی اور یہ واقعات ہم جگہ جگہ نہیں دُھرا سکتے تھے۔ جو وقت ضائع ہُوا سو ہُوا، باقی وقت ہم نے ندائے ملّت ہی میں ضائع کرنا ہے۔ وہ چاہیں تو ہمیں بنا دیں ؎

ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائگاں تو ہے

ہماری ضد رنگ لائی، وحید قیصر صاحب نے ہمیں ڈیسک پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد کوئی تقریباً ایکماہ کا عرصہ ایسا گزرا کہ وہ ہمیں مسلسل خبریں بنانے کو دیتے۔ شروع شروع میں تو دیکھے بغیر اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیتے پھر اتنی سی توجہ ملی کہ میز کی اِس طرف سے ہم خبر ان کی طرف بڑھاتے تو وہ اسے تھامتے تھامتے ردّی کی ٹوکری کی طرف لے جاتے ہوئے بس ذرا سا دیکھ لیتے۔ کئی بار جھنجھلاہٹ ہوئی کہ یہ کیا فرعونیت

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہے۔ خبر کو غور سے دیکھنا تو چاہیے، شاید ٹھیک بن ہی گئی ہو لیکن ہم ان جھنجھلاہٹوں کو جھٹکتے رہے اور پوری "ثابت قلمی" سے خبریں بنانے میں جُتے رہے۔ نیوز ڈیسک پر ایک دو ڈکشنریاں ہر دم موجود رہتی ہیں۔ اس دوران میں یہ ڈکشنریاں زیادہ وقت ہمارے قبضے میں رہتیں —— کسی کو کوئی لفظ دیکھنا ہوتا تو دائیں بائیں دیکھے بغیر اپنے پیڈ پر جھکا جھکا بولتا، "بھئی اشفاق، ڈِکشنری دینا ذرا۔"

اسی حال میں ہم نے کوئی ڈیڑھ ماہ گزار دیا۔ ایک دن یوں ہوا کہ وحید قیصر صاحب نے ہمارے ہاتھوں بنائی ہوئی ایک خبر پھینکتے پھینکتے روک لی۔ اسے اپنے رائٹنگ پیڈ پر رکھا، اس کے دائیں طرف یک کالمی خبر کا نشان بنایا، سُرخی جمائی اور کتابت کو بھیج دی

یہ خبر آخری صفحے پر کسی کونے کھدرے میں چھپی تھی۔ لیکن دُنیائے صحافت میں یہ ہمارا پہلا "کارنامہ" تھا —— دوسرا دن ہم نے اسی خبر کو پڑھتے رہنے اور دوستوں سے یہ پوچھنے میں گزار دیا کہ انھوں نے یہ خبر پڑھی ہے یا نہیں۔

انھی دنوں کا ذکر ہے۔ آدھی رات کا عمل ہوگا۔ وحید صاحب نے لمبی سی ایک کریڈ ہمیں تھماتے ہوئے کچھ کہا —— ہم نے ہڑبڑا کر کریڈ تھام لی۔ آنکھوں میں نیند کا خمار اُترا ہوا تھا۔ لفظ آپس میں گڈ مڈ دکھائی دے رہے تھے۔ کراچی سے حیدرآباد تک بننے والے سُپرھائی وے کی خبر تھی۔ آنکھیں کبھی مند جاتیں، کبھی کھل جاتیں۔ کوئی لفظ سامنے آ جاتا کوئی مِٹ جاتا —— "صدرِ پاکستان جنرل محمد یحییٰ خان —— افتتاح —— سڑک —— عوام کی بہتری وغیرہ وغیرہ —— ہم نے یہ جانا کہ صدرِ پاکستان نے سُپرہائی وے کا اِفتتاح کیا ہے اور یہ جو لمبی سی کریڈ ہے انھی کی تقریر ہے۔ لیکن کس جگہ کی ہے انھوں نے یہ تقریر —— کون ڈھونڈتا پھرے اب اس جگہ کا نام۔ صدر کے مقابلے میں اس جگہ کی کیا اہمیت ہوگی —— یوں لکھے دیتے ہیں کہ اس موقع پر منعقد ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا، اور اس کے بعد پوری تقریر کا بے دھڑک ترجمہ کیے دیتے ہیں۔ صدر کی تقریر ہے، کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ ذہن نے اس پر صاد کیا، چنانچہ ہم نے خبر بنائی۔

"آج صدرِ پاکستان جنرل محمد یحییٰ خان نے نئی تعمیر ہونے والی شارع حیدر آباد کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر منعقد ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شارع حیدر آباد کی لمبائی پچہتر میل ہے۔ اس کی تعمیر سے حیدر آباد اور کراچی کے درمیان اتنے میل کا فاصلہ کم ہو گیا ہے۔ اب لوگ محض اتنے گھنٹوں میں ان شہروں کے درمیان آ جا سکیں گے۔ دو طرفہ ٹریفک کی وجہ سے اشیائے خوردنی کی حمل و نقل میں آسانی رہے گی اور لوگوں کو یہ اشیاء سستے داموں مل سکیں گی۔ اس سڑک کی تعمیر پر ـــــ کروڑ روپے صرف ہوئے۔ فلاں سال میں اس کی تعمیر شروع کی گئی تھی اور اتنے انجنیئروں اتنے مزدوروں اور اتنے کارکنوں کی شبانہ روز محنتوں سے یہ سڑک اتنے دنوں میں مکمل ہوئی۔

خبر بناتے ہوئے ایک آدھ جگہ لمحے کے کسی حصے میں خیال آیا بھی کہ خبر کا انداز صدارتی نہیں ہے بھلا صدر کو سڑک کی لمبائی چوڑائی، اخراجات کی جمع تفریق اور مزدوروں کی گنتی سے کیا کام ـــــ لیکن ذہن پر نیند کا غلبہ تھا۔ اس نے اس وارننگ کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ بھئی صدر ہے جنگل کا بادشاہ ـــــ جو چاہے کہے، جو چاہے کرے اسے کوئی روک سکتا ہے۔ پھر صدر نے خود تھوڑا ہی لکھی ہو گی تقریر۔ کسی سیکرٹری وغیرہ نے لکھی ہو گی، صدر کا کام تو محض لکھی ہوئی تقریر کو پڑھ دینا ہے۔

خبر مکمل کر کے ہم نے وحید صاحب کے حوالے کر دی۔ انھوں نے ایک نظر خبر کو دیکھا، پھر کریڈ مانگی، پھر اس پر ایک سطر کو انڈر لائن کر کے ہمارے حوالے کر دیا۔ ہم نے آنکھیں کھول کر دیکھا پتہ چلا کہ سڑک کا افتتاح تو آئندہ روز ہونا ہے۔ تو پھر یہ لمبی چوڑی کریڈ کس بارے میں تھی۔

پتہ چلا جب پروگرام کے مطابق کوئی بڑی تقریب منعقد ہونا ہو تو ایک آدھ دن پہلے اس کے بارے میں تفصیلات مہیا کی جاتی ہیں تاکہ رپورٹر اور ایڈیٹر حضرات باخبر ہو جائیں اور انھیں اصل خبر والے دن اعداد و شمار جمع کرنے میں زیادہ بھاگ دوڑ نہ کرنی پڑے۔ عوام کا "جنرل نالج" بڑھانے کے لیے یہ خبر شائع بھی کر دی جاتی ہے لیکن مختصراً۔ اس خبر کو CURTAIN RISER کہتے ہیں۔ دھندلائی ہوئی یادوں میں شعبۂ صحافت کی کلاس روم

کا ایک بلیک بورڈ اُبھرا جس پر CURTAIN RISER کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے یقیناً تفصیل سے پڑھایا ہو گا لیکن ہم پیریڈ سے غیر حاضر رہے تھے اور محض ستانے کے لیے خالی کلاس روم میں چلے آئے تھے۔ اس دن کی غیر حاضری کا نتیجہ وحید قیصر سے ڈانٹ کی شکل میں مرتب ہو رہا تھا۔

مضمون کوئی بھی ہو جہاں جہاں طالب علم نے غفلت کا مظاہرہ کیا ہو گا اسے زندگی میں بھگتنا پڑتا ہے۔ کچھ مضمون ایسے ہیں جو طالب علم خود اپنی جان پر بھگت لیتا ہے اور گویا اس کی لاپرواہی کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے تاہم کچھ مضمون ایسے ہیں جن میں طلبہ کی غفلت کی سزا قوم کو ملتی ہے مثلاً میڈیکل کے طالب علم کی غیر حاضریاں مریضوں کی موت اور انجنیئروں کی لاپرواہی عمارتوں کی تباہی بن جاتی ہے۔ صحافیوں کے بارے میں کسی بڑے آدمی نے کہا تھا کہ اس کے نزدیک بے ضمیر طوائف تو گوارا ہے لیکن بے ضمیر صحافی ناقابلِ برداشت ہے کہ ایک طوائف بکتی ہے تو صرف اپنا جسم بیچتی ہے لیکن صحافی کا قلم بک جائے تو پوری قوم بک جاتی ہے، اس کا قلم بھٹک جائے تو پوری قوم بے راہ رو ہو جاتی ہے۔

ـــــ لیکن

طالب علمی کا زمانہ شوخیوں کے اظہار کا زمانہ ہوتا ہے۔ سلگتے جذبات کی تپش ان دنوں بھلی لگتی ہے۔ ہر تجربہ انسان کا پہلا تجربہ محسوس ہوتا ہے، نظروں کے تصادم سے خوبصورت حادثات جنم لیتے ہیں، عمریں کچی ہوتی ہیں، ذہن ناپختہ ـــ فون پر باتیں کرنا اچھا لگتا ہے، مسکراہٹیں خود بخود کھلتی رہتی ہیں۔ ساتھیوں کو بے وقوف بنا کر بے ساختہ قہقہے لگانا ذہانت میں شمار ہوتا ہے۔ ماتھے پر لٹ بکھرانا، پھر اک ادا سے اسے جھٹک دینا، تنہائی ملے تو آئینے میں خود کو پہروں دیکھنا، کسی خوبصورت ساتھی کی رفاقت کے خواب بُننا اور خیالوں کی دنیا میں حسین تاج محل تعمیر کرنا جوانی ہی کی باتیں تو ہیں۔ یہ مبارک ہیں وہ لوگ جو اقبال کی زبان میں کہہ سکیں ؎

بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

بات پھر کہیں سے کہیں نکل گئی۔ دراصل صحافت زیرِ گفتگو ہے نا ـــــ اور آپ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

دیکھتے ہیں ایک اخبار میں خبریں بھی ہوتی ہیں، اداریے بھی، کالم بھی، ڈائری بھی، افسانے بھی اور گپ شپ بھی ——— آئیے آپ کو پھر نیوز روم میں لے چلیں۔

اخبار کے دفتر میں نیوز روم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اخبار کے تمام رپورٹر اپنی خبریں یہیں جمع کرواتے ہیں، نیوز ایجنسیوں کے ٹیلی پرنٹر یہیں نصب ہوتے ہیں جس کے ذریعے اس کمرے کا رابطہ تقریباً پوری دُنیا سے ہوتا ہے۔ ریڈیو بھی اسی کمرے کی ایک میز پر پڑا ہوتا ہے اور ٹیلی فون بھی ——— جس کی گھنٹی وقفوں وقفوں سے بجتی ہے اور شہر شہر، گاؤں گاؤں کی خبریں نیوز ڈیسک پر جمع ہوتی رہتی ہیں۔ سیاسی رہنماؤں کے بیانات، حکومت کے پریس نوٹ، مزدور انجمنوں کے مطالبے، آجروں کی وضاحتیں، عدالتوں کی کارروائیاں، شہریوں کے مسائل، پولیس کی کارکردگی، طلبہ کی سرگرمیاں ——— غرض تمام چیزیں یہیں وصول ہوتی ہیں۔ ڈیسک انچارج کاغذات کے ان پلندوں سے کام کی چیزوں کا اِنتخاب کرتا ہے۔ سب ایڈیٹروں کی مدد سے ان کی نوک پلک سنوارتا ہے اور یوں اخبار کی خبریں مرتب ہوتی ہیں۔ یہ کام بڑی باقاعدگی سے، پورے نظم وضبط کے ساتھ لگی بندھی ترتیب کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ روزمرہ کے معمول میں سب ایڈیٹروں سے جو بدحواسیاں سرزد ہوتی ہیں، ڈیسک انچارج بڑے تحمّل سے انھیں برداشت کرتے ہُوئے غلطیوں کی اصلاح کرتا رہتا ہے لیکن کبھی کبھار پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ ان مواقع میں سے ایک موقع وہ ہوتا ہے جب ایڈیٹر کسی خبر پر ضمیمہ نکالنے کا فیصلہ کرے۔ عام طور پر یہ فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب خبر زبردست اہمیت کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ عوام میں گہری دلچسپی کا سامان بھی رکھتی ہو۔

انھی دنوں کا ذکر ہے بھارت کا گنگا نامی ایک طیارہ اغوا کر کے لاہور ایئرپورٹ پر اتارا گیا۔ اسے دو کشمیری جوانوں نے اغوا کیا تھا۔ گرچہ بعد کی عدالتی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ سب کچھ فراڈ تھا لیکن وقتی طور پر اس واقعے نے پُورے ملک میں تجسس پھیلا دیا تھا۔ لاہور تو ویسے بھی زندہ دِلوں کا شہر ہے۔ اس کے بحر کی موجوں میں اضطراب بڑی شدّت سے کارفرما ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کا اعلان ہُوا تو بچے، نوجوان اور بوڑھے

ہاتھوں میں لاٹھیاں، بانس، ہاکیاں یہاں تک کہ پتنگیں لوٹنے والے جھانگے اُٹھائے بارڈر کی طرف دوڑ پڑے تھے۔ جس دن بھارتی طیاروں اور پاکستانی شاہینوں کی لاہور کی فضاؤں میں جھڑپ ہُوئی اس دن لوگ چھتوں پر چڑھے "بوکاٹا" کے نعرے لگا رہے تھے ——— اور یہ جہاز تو ہوائی اڈے پر کھڑا تھا۔ پُورے شہر کو دلچسپی کا سامان ہاتھ آ گیا۔ لوگ گروہ در گروہ اسے دیکھنے آ رہے تھے۔ جُوں جُوں دن گزرتے گئے لوگوں کا تجسّس بڑھتا چلا گیا ——— اس واقعے کا نقطۂ عروج وہ تھا جب اسے آگ لگا دی گئی ——— روزنامہ ندائے ملت کے ایڈیٹر نے فوری طور پر ضمیمہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔

روزنامے میں جب ضمیمہ نکالنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو پریس کو خبردار کیا جاتا ہے، ہاکروں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لایا جاتا ہے۔ شہر کے مختلف حِصّوں میں تقسیم کے لیے گاڑیوں کا اِنتظام کیا جاتا ہے۔ اِدھر نیوز ڈیسک پر ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ پریس کا نمائندہ ڈیسک انچارج کے سر پر آ مسلط ہوتا ہے کہ کاپی دیں۔ کتابت سکشن میں ہیڈ کاتب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں۔ سب ایڈیٹروں کو دو تین ٹیموں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک ٹیم کا کام خبروں کی سپلائی لائن برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ وہ کچھ خبریں نیوز ایجنسیوں کے ٹیلی پرنٹروں سے حاصل کرتے ہیں، کچھ اپنے رپورٹروں سے۔ ایک ٹیم کتابت شُدہ لوازمے کی پروف ریڈنگ کرتی ہے اور ایک اور صاحب ڈیسک انچارج کے ساتھ مل کر تصحیح شُدہ لوازمے کو کاپی پر چسپاں کرتے ہیں ——— یہ سب کچھ بڑی تیزی سے ہوتا ہے۔ اِدھر کاپی تیار ہوتی ہے اُدھر دفتر کے باہر ہاکر اخبار وصول کرنے پہنچ چکے ہوتے ہیں۔

گنگا کو آگ لگانے کی خبر آئی اور ندائے ملت نے ضمیمہ نکالنے کا فیصلہ کیا تو ایک اور سینیئر سب ایڈیٹر کے ساتھ مِل کر خبریں بنانے کی ذمّہ داری ہمیں سونپی گئی۔ ٹیلی پرنٹر فلیش فلیش کی گھنٹیاں دیتے ہُوئے تیزی سے کریڈ اگل رہے تھے۔ رپورٹرز ایئرپورٹ سے فون پر فون کر رہے تھے جسے ایک اور صاحب وصول کر رہے تھے۔ ہم خبریں بناتے

رہے جب ترجمے کا کام ختم ہوگیا تو جھپٹ کر ہم نے پروف ریڈنگ بھی سنبھال لی — پروف پڑھتے ہوئے ایک فقرہ پڑھا، "قاسم* کو کہا گیا تھا کہ جب اسے سبز بتی دکھائی جائے تو وہ جہاز کو دھماکے سے اڑا دے۔" ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ یہ ایئرپورٹ پر سبز اور سُرخ روشنیاں تو جلتی بجھتی ہی رہتی ہیں۔ قاسم کو سبز بتی کس نے دکھائی تھی کریڈ نکال کر اصل متن پڑھا۔ قاسم کے اپنے ساتھی مقبول بٹ سے مذاکرات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا گیا تھا ـ

IT WAS A GREEN SIGNAL FOR QASIM TO BLOW UP THE PLANE

جس کا ترجمہ یوں چاہیے تھا، "قاسم کے لیے جہاز تباہ کرنے کا یہ واضح اشارہ تھا" —— ہم نے متعلقہ سب ایڈیٹر سے بات کی کہ یہ کیا ترجمہ کر مارا ہے انھوں نے —— کیا کیا جائے۔ اِس غلطی کی اصلاح کے لیے کم از کم پانچ سات منٹ تو چاہئیں تھے کہ صحیح ترجمہ ایک سلپ پر لکھا جاتا، اسے کتابت سیکشن میں بھیجا جاتا، وہاں کتابت ہوتی، پھر اس کی پروف ریڈنگ۔ تب وہ کاپی پر لگتا —— ادھر وحید صاحب چلّائے۔ خبریں، خبریں —— ادھر موصوف نے میرا ہاتھ دبایا اور اسی طرح وہ خبر وحید صاحب کو تھما دی۔

ضمیمہ نکلا بڑی شان سے۔ ندائے ملت کی دھوم مچ گئی۔ قارئین نے سبز بتی والا فقرہ جانے پڑھا یا نہیں لیکن جب ضمیمہ چھپ کر ڈیسک پر آیا اور غلطی کی نشاندہی ہوئی تو دفتر میں پھر سے بھونچال آگیا جس کی تفصیل کے لیے ایک الگ ضمیمے کی ضرورت ہوگی۔ صحافت اور فوج میں اصولی طور پر جلدی میں درستگی کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

وہ لطیفہ تو آپ نے سُنا ہوگا۔ ایک دن امریکہ میں ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی لفٹیں خراب ہوگئیں۔ دو آدمیوں نے اپنا دفتر کھولنے کے لیے آخری منزل تک جانا تھا ـ

---

* اغواکنندہ

انھوں نے اپنی گاڑیاں پارک کیں اور بادلِ نخواستہ سیڑھیوں کے ذریعے اوپر روانہ ہوگئے۔ وقت گزارنے کے لیے ایک نے شیکسپیئر کی ایک کامیڈی سنانی شروع کی۔ ہنستے ہنساتے جب آخری منزل تک پہنچے تو راوی نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ دُوسرے نے حیرت سے پوچھا، "سنا تو تم کامیڈی رہے تھے یہ رونا کیوں شروع کر دیا؟" بولا، "شروع تو میں نے کامیڈی ہی کی تھی لیکن وہ ٹریجڈی میں بدل گئی ہے کہ دفتر کی چابیاں تو میں نیچے ہی بھول آیا ہوں گاڑی میں۔"

ہر پیشے میں ہر طرح کے آدمی ملتے ہیں۔ کچھ لوگ پکے کامیڈین ہوتے ہیں، اپنا اُلّو سیدھا رکھنے والے۔ آسمان گر پڑے، زمین شق ہوجائے، سُورج مشرق کی جگہ مغرب کی طرف سے طلوع ہو، ان کی بلا سے وہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے قائل ہیں۔

صحافت بھی ایسے آدمیوں سے خالی نہیں۔ ہم نے ایک دفعہ ایک اچھی خاصی ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدلتے دیکھا۔ ہوا یوں کہ کچھ دوست فلم کا پروگرام بنا کر روزنامہ جاودان گئے۔ ایک سب ایڈیٹر کو بتایا گیا کہ فلم کا پروگرام ہے، اس کے پاس پیسے ہوں تو وہ بھی چلے۔ تفریحی پروگرام تھا موصوف بے تاب ہوگئے لیکن جیبیں خالی۔ ایک دو ساتھیوں سے اُدھار لینے کی کوشش کی لیکن مایوسی ہوئی۔ امید و بیم کے عالم میں تھے کہ ٹیلی پرنٹر نے فلیش فلیش کے سگنل دینے شروع کر دیے۔ فلیش کے لفظ پرنٹ ہوتے ہیں تو ٹیلی پرنٹر پر گھنٹیاں بھی بجتی ہیں — موصوف تیزی سے ٹیلی پرنٹر پر گئے، دیکھا راوات میں پی آئی اے کا ایک طیارہ گر کر تباہ ہوگیا ہے۔ انھوں نے وہیں رونا شروع کر دیا — ظہور عالم شہید ایڈیٹر تھے۔ وہ گھبرائے گھبرائے آئے، پُوچھا۔ "کیا ہُوا؟" موصوف نے بتایا کہ اس طیارے سے اس کا ایک قریبی کزن سفر کر رہا تھا، معلوم نہیں زندہ بچا یا شہید ہوگیا۔ شہید صاحب کی تمام تر شفقتیں امڈ آئیں۔ انھوں نے جیب سے پچاس روپے نکالے۔ تین دن کی چھٹی اور فوری طور پر گھر جانے کا حکم دیا۔ موصوف نے دوستوں کے ساتھ فلم بھی اڑائی اور تین دن تک لاہور میں دندناتے بھی پھرتے رہے۔ چوتھے دن دفتر رپورٹ کر دی اور بتایا کہ اس کے کزن نے سیٹ کینسل کروا دی تھی —— پوچھا گیا کہ پھر تین دن کیوں لگائے، جلد

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لوٹ آتے۔

"سر! شکرانے کے طور پر دیگیں پکوائی گئیں۔ ختمِ قرآن کی مجلس ترتیب دی گئی۔ گھر میں مہمانوں کا رش تھا۔"

تو صاحبو! یہ تھیں کوچۂ صحافت کی چند یادیں۔ جیسا ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ انہی میں سے کچھ یادیں ہمارے شمالی علاقے کی طرف پرواز کا باعث بنیں۔ آئیے آپ کو بھی وہاں لے چلیں کہ ہر طرف حسن کی فراوانی ہے اور سادگی کے باوقار جلوے۔

بلندیوں کی جانب

لاجواب پرواز

صاحبو! پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز کی پروازوں کے لیے "باکمال لوگ لاجواب پرواز" کا ماٹو شاید درست ہی ہو، لیکن ان کا تمام تر کمال پاکستان کے شمالی علاقوں میں زوال سے بدل جاتا ہے۔ ایک تو محاورتاً ہر کمالے را زوالے، دُوسرے شمال کی جانب سر اُٹھائے کوہِ ہمالیہ اور نانگا پربت کے فلک بوس سلسلے زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتے ہیں۔ ؎

جسے غرور ہو آئے کرے شکار ہمیں

ہم نے باکمال لوگ لاجواب پرواز کی صداقت شمالی علاقوں میں بہ نفسِ نفیس پچاس فیصد رہ جاتے دیکھی کہ بارہا پی آئی اے کے ٹکٹ خریدے اور باکمال کہلائے، لیکن پی آئی اے کے طیاروں نے لاجواب پرواز سے انکار کر دیا۔ یا کبھی کمرِ ہمت باندھی بھی تو بارہا ایسا ہُوا کہ اسلام آباد کے بین الاقوامی ہوائی اڈّے سے پرواز کرتے ہُوئے کپتان نے اعلان کیا:

"خواتین و حضرات! پاکستان انٹرنیشنل ایئرلائنز کی جانب سے کپتان راحت آپ کو خوش آمدید کہتا ہے ہم سترہ ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہُوئے انشاءاللہ ایک گھنٹہ پانچ منٹ میں گلگت پہنچیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرے گا۔ شکریہ۔"

لیکن ابھی سٹیورڈ خوشگواری کا پہلا آئٹم — ٹافیاں — ہی تقسیم کر رہا ہوتا کہ مائک پر پھر آواز اُبھرتی۔ "خواتین و حضرات! مہربانی فرما کر ذرا متوجہ ہوں۔ ہمیں افسوس ہے کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہم گلگت نہیں جا سکیں گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہم واپس اسلام آباد کے ہوائی اڈّے پر اُترنے والے ہیں آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ اپنے سیٹ بیلٹ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

باندھ لیجیے اور سگریٹ بجھا دیجیے ـــــ شکریہ۔"

ویسے ہمارے نزدیک پی آئی اے کا کچھ نہ کر سکنا بھی کمال ہی کے زمرے میں آتا ہے کہ غالب نے کہا تھا۔ ؎

بٹھا کے یار کو پہلو میں رات بھر غالبؔ
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

اور پی آئی اے والے مسافروں کو ایک رات نہیں کئی کئی راتیں انتظار میں رکھتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔

شمالی علاقوں میں پی آئی اے مسافروں اور موسم میں سارا سال آنکھ مچولی جاری رہتی ہے۔ مسافر تو ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں کہ انھیں رات کے پچھلے پہر یا وقتِ سحر ائیر پورٹ پر بلا لیا جاتا ہے اور پھر "ریلوکٹا" بنا کر ایک طرف بٹھا دیا جاتا ہے۔ اصل کھیل خود پی آئی اے والے موسم سے کھیلتے ہیں اور طیارے کو رَن وے پر کھڑا کر کے وائرلیس پر پکارتے ہیں

"لک چھپ جانا
مکئی دا دانا
راجے دی بیٹی
آئی ـــــ جے"

اب اگر گھنے بادل ہمالیہ کی چوٹیوں پر محوِ خرام اور کثیف دُھند وادیوں میں محوِ خواب ہو، نانگا پربت جیسا سر بفلک پہاڑ بھی اس کے سرہانے گم سُم کھڑا ہو تو گلگت سے وائرلیس پر گھبرائی گھبرائی سی آواز اُبھرتی ہے:

"ابھی نہیں، ابھی نہیں،
نہیں نہیں، ابھی نہیں۔"

ادھر راولپنڈی میں مسافر سوالیہ نشان بنے کاؤنٹر پر جاتے ہیں جہاں سفید وردی میں ملبوس پی آئی اے کا کوئی کارکن مشینی انداز میں دُہراتا رہتا ہے۔

"موسم صاف نہیں ہے سر!"
"موسم ٹھیک نہیں ہے سر!"

کوئی جھنجلایا ہُوا مسافر پُوچھ بیٹھتا ہے:

"کب ٹھیک ہوگا یہ موسم؟"

اور پی آئی اے کا کارندہ اسی مشینی انداز میں جواب دیتا ہے:

"کوشش کر رہے ہیں سر"

بھولے مسافر اس جواب پر مطمئن ہو کر چپکے بیٹھ جاتے ہیں۔

جونہی گلگت سے اوکے رپورٹ مِلے، ناردرن ایریا لاؤنج میں ایک طوفان سا آجاتا ہے۔ تیزی سے بُکنگ BOOKING شروع ہوتی ہے۔ آناً فاناً مسافروں کو جہاز میں بٹھایا جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد ہی طیارہ فضا میں بلند ہو کر اسلام آباد پر پرواز کرتا پہاڑوں میں گُم ہو جاتا ہے۔ تب اگر موسم مہربان رہے تو پائلٹ کے اعلان کے مطابق طیارہ سترہ ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہے لیکن اگر قُدرت کو شرارتیں سُوجھ رہی ہوں تو عناصرِ قُدرت اور طیارے میں ایک نیا کھیل شروع ہو جاتا ہے ہواؤں میں قُدرت نے جگہ جگہ اپنے گھر بنا رکھے ہیں۔ اصطلاحاً انھیں ائیر پاکٹ (AIR POCKET) کہتے ہیں۔ طیارہ جب ان میں سے گزرتا ہے تو ہوا نہ ہونے کی وجہ سے بے خودی کے عالم میں ان کی گود میں گِرتا چلا جاتا ہے تب اگر مسافر ناشتے میں مصروف ہوں تو ہوتا یوں ہے کہ جو آملیٹ اور توس کا لُقمہ منہ میں رکھ رہا ہوتا ہے اسے زبان پر جیلی کے ذائقے محسوس ہوتے ہیں اور جو سیب کے مربّے سے دِل کو تقویت دے رہا ہوتا ہے، اس کی آنکھوں میں کالی مرچوں کا سفوف آن پڑتا ہے۔ مردوں کی گود میں گلابی گلابی اُون کے لچھے، اَدھ بُنا مُنّا سا سوئیٹر، سیاہ یا براؤن نفیس سا پرس، لپ سٹک یا پاؤڈر کا پف اور خواتین کے شانوں پر کوئی کیمرہ یا دُوربین لٹکی نظر آتی ہے۔

جہاز سنبھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جو صاحب توس پر مکھن لگا رہے تھے وہ منہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

پر مل بیٹھے ہیں اور چُسکیاں لیتے ہُوئے جوان نے چائے کا پُورا کپ اپنے سے پچھلی نشست والے پر اُچھال دیا ہے۔ اپنی مسکراہٹیں بھُول جانے والی ایئر ہوسٹس کسی ہشاش بشاش بزرگ کی گود سے سنبھل رہی ہے اور سٹیورڈ لال پیلی ہوتی کسی مائی کو سمجھا رہا ہے کہ جھٹکا لگ گیا ہے وُہ جان بوجھ کر ان پر نہیں آن پڑا۔

یہ مواقع شاذ و نادر ہی آتے ہیں لیکن جب آتے ہیں تو بس آ جاتے ہیں البتہ قابلِ داد ہیں پی آئی اے کے پائلٹ جو دُنیا کے اس مشکل ترین رُوٹ پر فوکر کو ہنستے مسکراتے اڑائے لیے جاتے ہیں۔ موسم تیور بدل بدل کر رُکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ مہیب بادل چیختے چنگھاڑتے رہتے ہیں لیکن سحر کے اُجالوں میں روشنی کی ایک لکیر بھی نظر آ جاتے تو وہ فوکر کو صاف نکال لے جاتے ہیں۔ بارہا ایسا ہُوا کہ پنڈی میں رِم جھم رِم جھم پھوار پڑ رہی ہے۔ مسافر مایوس بیٹھے ہیں لیکن اچانک انھیں روانگی کی نوید سنائی جاتی ہے۔

بادلوں سے آنکھ مچولی کرتا طیارہ گلگت کی بلند و بالا چوٹیوں کو عبور کرتا، پیالہ نما ایئر پورٹ پر اُترتا ہے تو پُورے شہر میں خُوشگوار حیرت پھیل جاتی ہے۔

روزانہ ایئر پورٹ جا کر واپس آنا ایک معمول سا بن چلا تھا۔ جب ایک صبح ہم نے پنڈی کا موسم خاصا اَبر آلود پایا، نیند کا خمار بستر چھوڑنے نہ دیتا تھا۔ سوچا فون کر کے پتہ کر لیں کہ جہاز گلگت نہیں جا رہا نا۔ لیکن پی آئی اے والوں نے ہمیں فوری طور پر ایئر پورٹ پہنچنے کو کہا۔ جہاز پرواز کے لیے تیار تھا۔ حیرانی کے عالم میں ہم ایئر پورٹ پہنچے۔ سوچتے رہے ——— کہ جب اچھے بھلے چمکتے دمکتے دِنوں میں جہاز پرواز نہیں کرتا۔ تو آج پرواز کیوں کر ممکن ہو سکے گی؟ لیکن بادلوں کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ کچھ تو دھرتی ماتا کی قربت ہی میں خُوش رہتے ہیں، اس کی مٹی کی سانس کی گرمی انھیں مخمور رکھتی ہے اور وہ اٹھلائے پھرتے ہیں۔ کچھ بادلوں کو آوارگی کا شوق ہوتا ہے۔ چنانچہ ہوائیں انھیں دُور دُور بھگائے پھرتی ہیں۔ اس دن بادل تھے تو سہی، لیکن یہی آوارہ سے ــ جو اپنی دُھن میں مست رہتے ہیں، کسی سے کچھ کہتے سُنتے نہیں۔

چنانچہ فوکر اُڑا تو ایسا کہ بس اُڑتا ہی چلا گیا۔ کچھ دیر تو ہم اس کے مڑنے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن جب ایبٹ آباد اور مانسہرہ بھی گزر گئے تو یقین ہُوا کہ اب ایسی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ناممکن ہے۔ تب ہم نے اِرد گرد کے مناظرِ قدرت پر غور کیا۔ خدا کی عظمت اور اس کے صانع کائنات ہونے کا سچے دِل سے اعتراف کیا۔ کہ ان پُرشکوہ پہاڑوں میں اس نے حُسن کے وُہ روپ سمو دیے ہیں کہ بے اختیار سجدہ ریز ہونے کو جی چاہتا ہے لیکن ظاہر ہے فوکر طیاروں کی محدُود نشستیں رکُوع و سجود کے لیے نہیں، قیام و قعود کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ سو خُدا کے شُکر کے زبانی اعتراف پر اکتفا کرتے ہُوئے ہم کھڑکی کے مزید قریب ہُوئے اور دیکھا کہ تاحدِ نظر پھیلے پہاڑی سلسلے باہم مدغم ہو کر ایک میدان کا رُوپ دھار گئے ہیں اور ان پر برف یوں پھیلی ہُوئی ہے جیسے باری تعالیٰ نے بنی اِسرائیل کے لیے نعمتوں کا کوئی خوان نازل کیا ہو۔

"بنی اسرائیل کو جب اللہ تعالیٰ نے سینا کے صحراؤں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑا تو وہ چالیس سال وہیں کی خاک چھانتے رہے۔ شاید کہ ان کی نافرمانیاں انھیں لے ڈُوبتیں لیکن خُدا کا ایک پیغمبر ان کے ہمراہ تھا، ایک دِن ان کا ایک وفد حضرت مُوسیٰؑ کے پاس گیا اور فریادی ہُوا۔ "اے مُوسیٰؑ اپنے خُدا سے دُعا کر کہ ہمارے لیے آسمانوں سے کھانا اُتارے۔ . . . .

حضرت موسیٰؑ کی دُعا قبول ہُوئی اور آسمان سے من و سلویٰ اُترنا شروع ہوا۔ کہتے ہیں یہ ترنجبین کی طرح کوئی چیز تھی۔ دُودھیا سپید، شہد کی مانند میٹھی۔ برف کے گالوں کی طرح آسمان سے نازل ہو کر زمین کو ڈھانپ لیا کرتی، بنی اسرائیل کے لوگ صبح سویرے اُٹھ کر اسے اکٹھا کرتے اور چٹخارے لے لے کر کھایا کرتے۔"

ہمارے لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ طیارے سے نکل کر من و سلویٰ جیسی اس برف کا ذائقہ محسوس کر سکتے۔ سو محض اسے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور دُوسرے نظاروں میں کھو گئے۔

ناران کی جھیل سیف الملوک ان پہاڑوں میں یوں چمکتی ہے جیسے کسی نے پارے سے بھرا ہُوا پیالہ ان پہاڑوں میں رکھ دیا ہو۔ اسے عبور کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی دائیں طرف نانگا پربت کا عظیم پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بلندی اٹھائیس ہزار

چھ سو ساٹھ فٹ ہے اور یہ باقی پہاڑوں سے یکلخت بلند ہوتا یوں کھڑا ہے جیسے قدرت کی طرف سے اسے پہاڑوں پر محافظ مقرر کیا گیا ہو۔ نانگا پربت کا مطلب ننگا پہاڑ ہے اور یہ نام غالباً اسے اسی لیے دیا گیا ہے کہ یہ ارد گرد کے پہاڑی سلسلوں کی نسبت بالکل نمایاں واضح اور ننگ دھڑنگ سا نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس انہی سلسلوں کی ایک اور پہاڑی کا نام راکا پوشی ہے۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ راکا مقامی زبان میں چہرے کو کہتے ہیں۔ اس طرح راکا پوشی کا مطلب ہوا وہ چہرہ جو چھپا رہتا ہے۔ یہ پہاڑ چونکہ باقی پہاڑوں میں مستور ہے اور بادل بھی اسے اپنی اوٹ میں چھپائے رکھتے ہیں۔ اس لیے راکا پوشی کہلایا ۔۔۔ یورپ والے اسے مشرق کی حسین شہزادی BEAUTIFUL PRINCESS بھی کہتے ہیں کہ اس کے حسن کا چرچا سن کر ہر سال یورپی ممالک کی کئی مہماتی ٹیمیں یہاں آتی ہیں اور اسے سر کرنے کی کوشش کرتی ہیں نانگا پربت کی چوٹی دنیا میں نویں بلند ترین چوٹی ہے۔ پاکستان کی بلندیوں میں کے ٹو کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہے۔ اسے جرمن پہاڑ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، کیوں کہ اسے سر کرنے کے لیے آنے والی بتیس مہموں میں سے تیرہ کا تعلق جرمنوں سے تھا۔ اسے سب سے پہلے سر بھی ایک جرمن مہم نے کیا جس کی قیادت ہارنگ کومز کر رہے تھے۔ یہ تاریخی واقعہ ۳ جولائی ۱۹۵۳ء کو وقوع پذیر ہوا ۔۔۔ دنیا کی بلند ترین چوٹی ایورسٹ (۲۹۵۲۸ فٹ) بھی اسی سال ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کو برطانوی کوہ پیما سر ایڈمنڈ ہلاری کی زیر سرکردگی سر کی گئی۔

جرمنوں کے علاوہ نانگا پربت کو آسٹریا نے تین مرتبہ، چیکوسلواکیہ، اٹلی اور ہالینڈ کی مہموں نے ایک ایک مرتبہ فتح کیا۔ نانگا پربت کو دو بار سر کرنے والا آسٹریا کا کوہ پیما کارین ہولڈ میسنر دنیا کا واحد کوہ پیما ہے جس نے اب تک آٹھ ہزار میٹر سے اونچی پانچ پہاڑوں کی چوٹیاں سر کی ہیں۔ ان میں کے ٹو، نانگا پربت اور راکا پوشی پاکستان میں اور ایورسٹ اور مناسلو نیپال میں واقع ہیں۔

نانگا پربت کو کل نو مرتبہ سر کیا جا چکا ہے اور مہم جو افراد کو اس کی بھاری قیمت

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ادا کرنا پڑی ہے۔ نصف درجن اقوام کے تقریباً چالیس افراد اب تک اس کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں ؎

عشق کے ہاتھ میں گر حسن کی تلوار نہ ہو
کوئی یوں جھوم کے سر دینے کو تیار نہ ہو

اور نانگا پربت حسین ہے، دلفریب ہے، خوبصورت ہے، پیارا بے تحاشا۔ ایک تو اس کا وجود بجائے خود حسن اور ہیبت کا عظیم مجسمہ ہے، دوسرے جن پہاڑوں سے مل کر یہ بنا ہے، ان کی تراش خراش میں قدرت نے بڑے جمالیاتی ذوق سے کام لیا ہے اس کا ایک فیچر ہے راس الثور BULL'S HEAD یعنی بیل کا سر۔ یہ ایک بڑی چٹان ہے جس کا ایک حصہ بالکل عمودی ڈھلوان پر مشتمل ہے اس پر برف گرتی ہے تو ٹھہر نہیں پاتی۔ پھسل پھسل کر گرتی رہتی ہے۔ عمودی چٹان کا یہ حصہ بالکل گول ہے برف سے ڈھکی ہوئی باقی چٹان کے ساتھ یہ بغیر برف والا حصہ جہاز سے ایک آنکھ کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ چٹان کی باقی تراش خراش بالکل بیل کے منہ کے سائڈ پوز کی سی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی غضب ناک بیل پلک جھپکائے بغیر جہاز کو گزرتا دیکھ رہا ہو۔

راس الثور کے بالکل قریب پربتوں کی ایک شہزادی محو خواب ہے۔ ہم نے پہلے سے اس کا ذکر سن رکھا تھا۔ ایر ہوسٹس کو بلوا کر اس کا اتہ پتہ پوچھا تو وہ اک شانِ دلربائی سے زلفیں جھٹکتی اپنی لاعلمی کا اظہار کرتی واپس چلی گئی۔ کسی بھی حسین سے کسی اور حسن کے بارے میں معلومات دریافت کرنا کور ذوقی ہے اور مثبت جواب کی توقع رکھنا حماقت۔ انتہائے معصومیت میں ہم دونوں غلطیوں کے مرتکب ہو چکے تھے لیکن اس کی تلافی یوں کی کہ قریب سے گزرتے ہوئے سٹیورڈ کے ہاتھوں پائلٹ کو پیغام بھجوایا کہ ذرا دیر کے لیے ہمیں کاک پٹ میں بلوائیے۔ ضروری کام ہے۔ ان دنوں جہازوں کے اغوا کا کاروبار خاصا پھیلا ہوا تھا۔ اور کاک پٹ کی طرف رخ کرنا کئی غلط فہمیو کو جنم دے سکتا تھا۔ لیکن وردی کام آئی اور اجازت ملنے پر ہم کیمرہ سنبھالے کاک پٹ میں

جا پہنچے۔ پائلٹ سے "خوابیدہ حُسن" کی زیارت کے طالب ہُوئے۔ کیپٹن راحت کی نشاندہی پر اس حُسن کی کھٹا کھٹ کئی تصویریں اتار ڈالیں۔ بعد میں فلم دُھلوائی تو دو تین تصویریں ٹھیک آئی تھیں۔

"خوابیدہ حُسن" ہم نے سلیپنگ بیوٹی SLEEPING BEAUTY کا ترجمہ کیا ہے۔ اِسی نام سے یہ پہاڑ جانا جاتا ہے اور اس کی تراش خراش ایسی ہے کہ طیارے سے یوں دکھائی پڑتا ہے جیسے بھرپور بدن کی کوئی جواں سال لڑکی پہاڑوں کے ان ویرانوں میں آن سوئی ہو۔ سر کی جانب پہاڑ میں ایسی لکیریں STREAKS بنی ہوئی ہیں جو اس کے بِکھرے بالوں کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔

پی آئی اے کے پائلٹوں کے لیے "راس النور" اور "خوابیدہ حُسن" اہم ریفرنس پوائنٹ ہیں کہ ان پہاڑوں میں آلاتی پرواز INSTRUMENTAL FLIGHT کی جگہ نظری پرواز VISUAL FLIGHT کو ترجیح دی جاتی ہے اور نظری پرواز میں زمین پر واقع اہم جگہوں کی اہمیّت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ گلگت کی جانب پرواز ہو تو اِن دونوں فیچروں کو دائیں جانب رکھتے ہُوئے پائلٹ جگلوٹ کی وادی میں جا پہنچتے ہیں اور سکردو جانا ہو تو "محوِ خواب حُسن" کو عبُور کرنے کے بعد جہاز راس النور سے پہلے ہی دائیں مُڑ جاتا ہے۔

سینے میں دھڑکتا دِل رکھنے والی کوئی لڑکی ہوتی تو طیارے کی آواز سُن کر جاگ اٹھتی ہمیں دیکھ کر پہلے ہنستی پھر روتی۔ اس سے ہنسنے اور رونے کا سبب پُوچھا جاتا تو کہتی "ہنسی تو مجھے یوں آئی کہ اتنے دِنوں کی مسلسل برف باری کے بعد آج موسم اُجلا ہُوا اور کسی آدم زاد کا چہرہ دیکھنا نصیب ہُوا اور روئی یوں کہ دیو جیسے کالے کالے بادل ابھی آن موجود ہوں گے اور چاروں طرف پھر اسی شب کا سیاہی کا سماں ہوگا۔ یہ طیارہ گلگت میں رُکا رہے گا اور اسے واپس آنا نصیب نہ ہوگا۔"

لیکن پی آئی اے کے پائلٹ بڑے تجربہ کار اور مشّاق ہیں۔ یہی بات وہ "خوابیدہ

حُسن" جیسی سنگدل اور سنگ تن لڑکی سے بھی اُگلوا لیتے ہیں اور وہاں کے مناظر میں دِل لگانے کی بجائے جگلوٹ کی وادی میں جا پہنچتے ہیں اور دائیں بائیں کے پہاڑوں سے طیارے کے ڈِنگ بچاتے ماہرانہ انداز میں پیالہ نما گلگت کے ایئرپورٹ پر اتر جاتے ہیں اور اس سے پہلے کہ بادلوں کے دیو "آدم بو! آدم بو" چلاتے ہُوئے "خوابیدہ حسن" کے اردگرد وحشیانہ رقص شروع کریں، یہ گلگت کی سواریوں کو لے کر واپس اسلام آباد کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اُتر جاتے ہیں۔ موسم صاف ہو تو طیارے کو پھر رَن وے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے اور بذریعہ وائرلیس پھر پکارا جاتا ہے

ے
ٹُک چُھپ جانا
مکئی دا دانا
راجے دی بیٹی
آئی سجے

لیکن موسم کے تیور بگڑ گئے ہوں تو کھیل ختم، پیسہ ہضم۔ منتظر مسافروں کو آئندہ روز آنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

دیومالائی گلگت

روشن روشن صبح کے اجالوں میں گلگت ایئر پورٹ پر اُترے تو ایک خوشگوار خنکی کا احساس ہُوا۔ بہت سے لوگ ایئر پورٹ پر جمع تھے، کچھ تو جانے والوں کو الوداع کہنے آئے تھے اور بہت سے لوگ طیارے کے اُترنے چڑھنے کا منظر دیکھنے۔ ان دنوں گلگت میں مصروفیات اتنی زیادہ نہیں تھیں اور جہاز کی آمد کی خبر سُن کر بہت سے لوگ اسے دیکھنے ہی ایئر پورٹ چلے آتے تھے۔ افسروں میں چند شناسا چہرے بھی نظر آئے جن کے ساتھ ہم فورس کمانڈر ناردرن ایریا کے ہیڈ کوارٹر چلے آئے۔ ہماری منزل گلگت سے اسّی میل جنوب میں تھی۔ رات گلگت ہی میں بسر کرنا تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ دُوسرے دن میل سروس (MAIL SERVICE) کی ایک جیپ استور جا رہی ہے اس میں جگہ مِل سکے گی۔

لیکن اِس سفر کی رُوداد سے پہلے ایک نظر اس علاقے کی تاریخ پر بھی ڈال لیں۔

علاقے کا ماضی دیومالائی کہانیوں اور بغداد کے سے افسانوی قصّوں میں ملفوف ہے کہتے ہیں ایک زمانے میں یہاں ایک حکمران شیری بدت کا سکّہ چلتا تھا جسے بھیڑ کا گوشت بہت پسند تھا۔ اس کے کارندے دُور دُور سے اس کے لیے فربہ اور صحت مند بھیڑیں تلاش کر کر کے لایا کرتے۔ ایک دِن کھانا کھاتے ہوئے اسے محسوس ہُوا کہ بھیڑ کا گوشت عام دِنوں کے مقابلے میں اِنتہائی لذیذ ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ آئندہ سے گوشت اسی طرح پکایا جائے اس کا ذائقہ تبدیل نہ ہونے پائے لیکن بعد میں باوجود کوشش کے اسی جیسی لذت پیدا نہ ہو سکی۔ شیری بدت سخت جھنجلایا، خادموں کو بُرا بھلا کہا اور تحقیق شروع ہُوئی کہ اس دن کھانے کے لوازمات کیا کیا تھے۔ اِسی جستجو میں اس بھیڑ کے مالک کی تلاش بھی ہُوئی جس کا گوشت پکایا گیا تھا۔ کافی جدوجہد کے بعد وہ بُڑھیا دستیاب ہُوئی جس نے بھیڑ راجہ کے کارندوں کے ہاتھ فروخت کی تھی ـــــ معلوم ہُوا کہ اس بھیڑ کی پیدائش کے وقت اس کی ماں مرگئی تھی اور اس پر رحم کھاتے ہُوئے بڑھیا نے چند روز تک اسے خُود اپنا دُودھ پلایا ـــــ یہ سُن کر راجہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے سوچا کہ اگر چند دِن انسانی دودھ پی کر بھیڑ کا گوشت اتنا لذیذ ہو سکتا ہے تو اِن بچوں کا گوشت کتنا مزیدار ہو گا جن کا دارومدار ہی ماؤں کے دُودھ پر ہوتا ہے۔ اس نے حکم جاری کیا کہ آئندہ اس کے دسترخوان پر انسان کے بچّوں کے علاوہ کوئی اور گوشت نظر نہ آئے۔ چاروں طرف خوف و ہراس پھیل گیا لیکن شیری بدت کے ظُلم کے سامنے کوئی آواز بلند نہ ہو سکی۔

کچھ دنوں بعد سکردو کے ایک سردار آذر کے تین بیٹوں حزر، جمشید اور شمشیر نے گلگت کے مضافاتی علاقوں پر حملہ کر کے انھیں فتح کر لیا۔ دینور میں اپنے قیام کے دوران ایک دن انھوں نے ایک انتہائی خوبصورت گائے چرتی دیکھی۔ اس کی فربہی نفیس اور لذیذ گوشت کی چغلی کھا رہی تھی، شمشیر نے تیر کمان میں جوڑا اور گائے کو مار گرایا۔ حسبِ توقع گوشت نہایت لذیذ نکلا۔ حزر اور جمشید نے پیٹ بھر کر کھایا لیکن شمشیر نے چند لقموں کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ گائے جانے کس عالم کی مخلوق تھی۔ کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد ہی حزر اور جمشید کے پر نکل آئے۔ انھوں نے پر ہلائے تو دیکھا کہ وہ اُڑنے پر قادر ہیں تھوڑی دیر میں وہ دونوں شمشیر کو اکیلا چھوڑ کر پرواز کر گئے۔ شمشیر نے بھی اُڑنے کی سعی کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ اُس نے گائے کا گوشت بہت کم کھایا تھا۔

دینور کے باسیوں نے حزر اور جمشید کو اُڑتے دیکھا تو شمشیر کو گھیر لیا اور اسے پرستان کا شہزادہ سمجھ کر بڑی عزت و احترام سے پیش آئے۔ بعد ازاں اسے اپنا سردار بنا لیا۔

ایک دن شمشیر اپنے مصاحبوں کے ہمراہ مارخور کے شکار پر نکلا ہُوا تھا۔ ایک جگہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

چند سایہ دار درخت اور چشمہ نظر آیا۔ تھکے ہارے تو تھے ہی، ستانے کو وہیں بیٹھ گئے۔ یہ جگہ راجہ شیری بدت کی اکلوتی بیٹی میوخانی سونی کی تھی۔ اس کی کنیزوں نے اسے اِطلاع دی کہ چند اجنبی لوگ اس کے علاقے میں گھس آتے ہیں اور چشمے پر بیٹھے ہیں۔ میوخانی باپ کی طرح غصّے کی پرکالی تھی۔ حکم دیا کہ سب کو گرفتار کر کے پیش کیا جائے۔ حسن جلال میں ہو تو اور حسین ہو جایا کرتا ہے۔ قیدی پیش کیے گئے تو شمشیر سارے اَدب آداب بھلا کر شہزادی کو دیکھتا چلا گیا۔ دِل کے آنے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ کہاں تو شہزادی آگ بگولہ ہو رہی تھی کہاں اسے جوان کی یہ ادا ایسی بھائی کہ دِل دے بیٹھی۔ اجنبی لوگ قیدیوں سے شاہی مہمانوں میں بدل گئے۔ انھیں بڑے احترام سے رُخصت کیا گیا۔ لیکن مِلنا مِلانا بعد میں بھی جاری رہا۔ تا آنکہ دونوں رِشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

بعد میں شمشیر کو شیری بدت کے ظُلم و ستم کا پتہ چلا تو اُس نے تہیّہ کیا کہ وہ گلگت کے لوگوں کو اس کے ظُلم سے رِہائی دلوا کر دم لے گا۔ بیوی سے پتہ چلا کہ شیری بدت ایک ماورائی مخلوق ہے جس کی موت کا راز کسی کو معلوم نہیں۔ شمشیر نے بیوی سے اِصرار کیا کہ اپنے باپ کی موت کا راز معلوم کرے۔ کچھ دنوں بعد وہ یہ کھوج نکال کر لائی کہ شیری بدت کا وجود مکھن نما کسی سیال مادّے سے تخلیق ہُوا ہے اور آگ کی تپش اس کے لیے موت کا پیام ہے۔

شیری بدت کی موت کا راز معلوم ہونے پر شمشیر نے چند آدمی اپنے ساتھ لیے اور مشعلیں اُٹھائے شیری بدت کے محل پر حملہ آور ہُوئے۔ شور و غل سُن کر وہ باہر نکلا تو ہر طرف آگ کے شعلے تھے۔ جان بچانے کو وہ فضاؤں میں بلند ہُوا اور چتوڑ کھنڈ کی طرف اُڑ گیا اور ایک گلیشیر کے نیچے جا چھپا۔ مقامی توہّمات کے مطابق شیری بدت اس گلیشیر کے نیچے اب تک زندہ ہے اور اپنی ریاست پر حکمرانی کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔

مقامی لوگ ہر سال ایک خاص دِن آگ کے الاؤ روشن کرتے ہیں اور تمام رات اس کے گرد رقص کرتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق آگ کی موجودگی میں شیری بدت دوبارہ نہیں آسکتا۔ آگ جلانے اور رقص و سرود کی اِن محفلوں کو رسمِ مالینو کہتے ہیں۔ دُوسرے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

دِن سہ پہر کے وقت پانچ بھیڑوں کی قُربانی دی جاتی ہے۔ اِن بھیڑوں کا گوشت خُشک کر لیا جاتا ہے۔ اور آئندہ ماہ تک اِستعمال کیا جاتا ہے۔ قربانی کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ آئندہ سال تک وہ شیری بدت کی واپسی سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس رسم کو نسالو کہا جاتا ہے۔

یہ تو ہُوئی دیومالائی کہانی جو سینہ در سینہ مُنتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ اب آزادی کی تارِیخ بھی سُنیے جو لہو کی سُرخیوں سے عبارت ہے۔ یہ تاریخی یادداشتیں ہم نے راولپنڈی کے صحافی جناب سعُود ساحر کے ساتھ مِل کر مرتّب کی تھیں اور اِس سلسلے میں ہمیں جدّوجہدِ آزادی کے مختلف کرداروں سے براہِ راست مُلاقات کا شرف بھی حاصل ہُوا۔ ہمارے عِلم کے مطابق تارِیخ کا یہ سُنہری باب ابھی تک اہلِ عِلم کی توجہ سے محروم ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تارِیخ میں درک رکھنے والے کوئی صاحب تحقیق و جستجو کے بعد تفصیل سے اِس موضوع پر قلم اُٹھائیں کہ یہ ہماری اپنی تارِیخ ہے۔ وفاؤں بھری تارِیخ۔ یہاں تو محض اجمالی تعارُف مقصود ہے۔

تقسیم سے پہلے گلگت بلتستان کا علاقہ ریاست کشمیر کا حِصّہ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں انگریزوں نے یہ علاقہ مہاراجہ کشمیر ہری سِنگھ سے ساٹھ سالہ پٹّے پر حاصل کیا لیکن جب انھیں محسوس ہُوا کہ برصغیر میں ان کا مزید قیام ممکن نہیں اور بہت جلد انھیں بوریا بستر باندھنا پڑے گا تو یہ علاقہ بھی انھوں نے مہاراجہ کو لوٹا دِیا جس نے اپنے چچا زاد بھائی بریگیڈیر گھنسارا سِنگھ کو جو اس وقت سرینگر میں بریگیڈ کمانڈر تھا، گورنر بنا کر گلگت بھیج دِیا۔

اس وقت کشمیر کی چالیس لاکھ میں سے بتیس لاکھ آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور واضح طور پر پاکستان سے الحاق کی خواہاں لیکن بدقسمتی سے ریاست کی باگ ڈور ایک سکھ کے ہاتھ میں تھی جس سے کسی خیرخواہی کی اُمید نہ تھی۔ چنانچہ مختلف حلقوں میں مسلمانوں نے اپنا مستقبل آپ سنوارنے کے لیے اپنے طور پر جدّوجہد کا آغاز کیا۔ فوجی حلقوں میں کرنل مرزا محمد حسن خان، کیپٹن بابر، ونگ کمانڈر شاہ عالم خان نے کام شروع

کیا۔ اور شہریوں کو آزادی کی جدوجہد کے لیے تیار کرنے کا بیڑا شاہ رئیس خان، محمد علی بربری اور عبدالحمید نے سنبھالا۔

کرنل حسن خان اس وقت میجر تھے اور سرینگر میں چھٹی کشمیر انفنٹری کی "سی" کمپنی کمان کر رہے تھے۔ انھوں نے میجر محمد دین، میجر محمد افضل خان (شہید) اور کیپٹن محمد اسلم کے ساتھ مل کر ایک خفیہ فوجی تنظیم قائم کی۔ بارہ اگست کو انھیں گلگت پہنچنے کا حکم ملا۔ گلگت سرینگر سے ۲۲۵ میل شمال میں واقع ہے۔ ان کی روانگی کے بعد ڈوگرہ حکومت کو ان کی سرگرمیوں کا علم ہوا، چنانچہ ان کی گرفتاری کے احکامات صادر کیے گئے لیکن مسلح کمپنی کی موجودگی میں سول پولیس کے لیے انھیں گرفتار کرنا ممکن نہ تھا چنانچہ ایک اور مسلمان کرنل مجید کو یہ مشن سونپا گیا جو اپنی بٹالین سمیت میجر حسن کو گرفتار کرنے روانہ ہوئے۔ دونوں کی ملاقات یکم ستمبر کو بونجی میں ہوئی۔ کرنل مجید نے میجر حسن کو بلا بھیجا اور گرفتاری کا پروانہ سنایا لیکن میجر حسن نے کرنل مجید کو صاف صاف بتا دیا کہ ان کی گرفتاری کی صورت میں ان کی کمپنی خاموش نہیں رہے گی۔ اور خون خرابے میں جتنے افراد بھی مارے گئے، ان کا خون کرنل مجید کی گردن پر ہوگا۔ مصلحت کے تحت کرنل مجید نے گرفتاری ملتوی کر دی۔

بعدازاں میجر حسن خود گلگت پہنچ گئے اور وہاں سے گورنر کی طرف سے ایک فرضی پیغام کرنل مجید کو بھجوایا کہ وہ فوراً گلگت پہنچے۔

ادھر صوبیدار میجر جو بعد میں کیپٹن بابر کے نام سے مشہور ہوئے، سرگرمِ عمل تھے وہ سکاؤٹوں کے ہر دلعزیز افسر تھے۔ سکاؤٹس کی کمانڈ ایک انگریز میجر براؤن کے پاس تھی۔ کیپٹن میتھی سن اس کا نائب تھا۔ ۲۷ اکتوبر کو جب مہاراجہ ہری سنگھ نے کشمیر کی اکثریت کی مرضی کے خلاف بھارت سے الحاق کا اعلان کیا تو کیپٹن بابر نے جرأتمندانہ اقدام کیا۔ انھوں نے اپنے کمانڈنگ آفیسر اور نائب کمانڈر دونوں کو گرفتار کیا پھر چودہ سکاؤٹوں کو ساتھ لے کر گورنر بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ کی رہائش گاہ کا محاصرہ کر لیا۔

گھنسارا سنگھ نے اندر سے فائر کیا جس سے ہنزہ کے رہنے والے ایک سکاؤٹ امیر حیات کی شہ رگ پر گولی لگی جو وہیں دم توڑ گیا۔ گلگت بلتستان کی جنگِ آزادی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کا یہ پہلا شہید تھا۔

سکاؤٹس پیچھے ہٹ آئے اور پوزیشنیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ گورنر کے ساتھ تین آدمی اور تھے، اس کا اردلی، سکھ بیرا اور کلرک۔ چاروں تمام رات اندر سے فائرنگ کرتے رہے۔ رات کے پچھلے پہر کیپٹن بابر نے ایک اور ترکیب آزمائی۔ انھوں نے ایک ہندو نائب تحصیلدار کو پیغام دے کر اندر بھیجا کہ مزاحمت فضول ہے۔ ہتھیار ڈال دو ورنہ صبح ہوتے ہی تمام غیر مسلم آبادی کا قتلِ عام کر دیا جائے گا۔

رات بھر گھنسارا سنگھ لڑتا رہا، ٹوٹتا رہا اور بالآخر صبح ہتھیار ڈال دیے۔ باہر آنے لگا تو صدر دروازے پر امیر حیات کا خون پڑا تھا۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا کیپٹن بابر نے کہا آزادی کے لیے قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے۔

گھنسارا سنگھ کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ ڈنڈوں اور کلہاڑوں سے مسلح ہو کر بازاروں میں نکل آئے۔ لیکن سکاؤٹس اسے گھیرے میں لیے چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئے۔ لوگوں کے ڈر سے گھنسارا سنگھ کیپٹن بابر سے چپٹ چپٹ جاتا تھا۔ اسے بحفاظت چھاؤنی لایا گیا اور صوبیداروں کی ایک بیرک میں رکھا گیا۔ اس کے بعد تمام لوگ پولوگراؤنڈ میں جمع ہوئے۔ میجر حسن بھی بونجی سے پہنچ چکے تھے۔ پولوگراؤنڈ میں جمِ غفیر سے خطاب کرتے ہوئے ان رہنماؤں نے گلگت بلتستان کی آزادی کا اعلان کیا۔ نظم و نسق چلانے کے لیے ایک انقلابی کونسل کی تشکیل کی گئی جو میجر حسن خان، کیپٹن بابر، لیفٹیننٹ غلام حیدر، عبدالحمید اور شاہ خان پر مشتمل تھی۔ شاہ رئیس خان کو جمہوریہ گلگت کا پہلا صدر مقرر کیا گیا۔

اجتماعِ عام کے بعد چھاؤنی میں انقلابی کونسل کا اجلاس ہوا۔ اجلاس جاری تھا کہ کرنل مجید کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ اس پیغام کے جواب میں بونجی سے گلگت کے لیے روانہ ہوئے تھے جو کرنل حسن نے گورنر بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ کی طرف سے انھیں بھجوایا تھا۔ کیپٹن بابر اجلاس سے باہر آئے اور کرنل مجید کے گھوڑے کی باگیں تھام کر انھیں چھاؤنی کی طرف لانے لگے۔ کرنل مجید نے کہا کہ وہ سب سے پہلے بریگیڈیئر گھنسارا

سنگھ سے ملیں گے۔ انھیں بتایا گیا کہ وہ بھی چھاؤنی میں "مہمان" رکھے گئے ہیں۔ بیرک پر پاکستانی پرچم لہراتا دیکھ کر کرنل مجید کا ماتھا ٹھنکا۔ انھیں ساری صورتِ حال بتائی گئی اور کہا گیا کہ وہ آزادی کی جدوجہد میں کونسل کا ساتھ دیں۔ کرنل مجید کو یہ بات سمجھ ہی میں نہ آتی تھی کہ بے سروسامانی کے اِس عالم میں پاکستان سے الحاق کا کیا مطلب ہے چنانچہ انھیں بھی گورنر گھنسارا سنگھ کے ساتھ والے کمرے میں "محفوظ" کر دیا گیا۔

انقلابی کونسل کا اجلاس ختم ہوا۔ کرنل حسن گلگت اور ہنزہ سکاؤٹس کو منظم کرنے کے بعد بونجی روانہ ہو گئے۔ چلاس میں مقیم سکاؤٹس کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ بھی بونجی کی طرف پیش قدمی شروع کر دیں۔ ڈوگرہ فوجوں نے صورتِ حال بھانپ کر پرتاب پل کو آگ لگا دی۔

کرنل حسن سکاؤٹس کے ہمراہ جگلوٹ پہنچے۔ وہاں سے کشتیوں کے ذریعے دریا عبور کیا تو سکھوں کی ڈیڑھ کمپنیاں مورچہ بند تھیں۔ گھمسان کا رن پڑا۔ جگلوٹ کے بعد بونجی کا رُخ کیا گیا۔ وہاں پہنچے تو ایمان افروز منظر تھا۔ ڈوگرہ فوج کے مسلمان افسر، سپاہی اور سوار، ڈوگروں اور سکھوں کے مقابلے میں پہلے سے مورچے سنبھالے تھے، ان کی تعداد اسّی کے قریب تھی اور وہ ساڑھے چھ سو سکھ فوجیوں کے مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے۔ مسلمان افسروں میں کیپٹن محمد خان، لیفٹیننٹ نادر علی، لیفٹیننٹ بوستان علی اور لیفٹننٹ محمد علی پیش پیش تھے۔ وہ اپنے مورچوں سے سکھوں کو للکار رہے تھے۔ کہ مجاہدین بہت بڑا حملہ کرنے والے ہیں۔ ہتھیار ڈال دو۔

سکھ یہیں اُلجھے رہے اور کرنل حسن دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی ڈوگرہ فوجی بونجی سے بھاگ نکلے۔ بونجی کے بعد اِردگرد کی فوجی چوکیاں بھی خالی ہونے لگیں۔ کرنل حسن نے افسروں کی قیادت میں مختلف دستے ترتیب دیے اور انھیں مختلف سمتوں میں روانہ کیا۔ جنھوں نے اہم فوجی کامیابیاں حاصل کیں۔ دسمبر

کے بعد برفباری کی وجہ سے راہیں مسدود ہو گئیں؛ درّہ برزل کو عبور کرنا مشکل ہو گیا۔ پیش قدمی روک دی گئی۔

ادھر شاہ رئیس خان نے صدارت کے فرائض سنبھالتے ہی قائدِ اعظمؒ اور پشاور میں خان قیوم کو برقی پیغام ارسال کیے کہ ہم نے گلگت میں ہندوؤں کو سرنگوں کر کے اِسلام کا پرچم سربلند کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ ہم نے پاکستان کی خاطر کیا ہے۔ ہمارا الحاق قبول فرمائیے۔

۱۵ نومبر کو پاکستان کا پہلا نمائندہ عالم خان پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے گلگت پہنچا اور آتے ہی رئیس خان سے تمام اِختیارات سنبھال لیے۔

اس کے بعد کیا ہوا، تلخیوں اور دکھوں کی کہانی ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنے خون سے آزادی کی شمع روشن کی، صبح کے ستاروں کے ساتھ ڈوب گئے یا گوشۂ گمنامی میں چلے گئے اور وہ لوگ کہ اندھیروں کے پاسبان ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے، اُجالوں کے "پاسدار" بن بیٹھے۔ وہ لوگ جنھوں نے عُسرت و افلاس کے عالم میں لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور پرانی طرز کی بندوقوں سے ہندوؤں کی توپوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بلتستان اور تحصیل کارگل کے علاقے آزاد کرائے تھے، کسمپرسی کی داستان بن گئے، برفانی علاقوں میں دشمن سے لڑتے ہوئے جنھیں برف کی بیماریوں SNOW BURN، FROST BITE نے آن گھیرا تھا، اپاہج ہو گئے، ان کا کوئی پرسانِ حال نہ رہا۔

ہمیں ایسے کئی افراد سے ملنے کا اِتفاق ہوا۔ تمام تر مجبوریوں کے باوجود ان کے چہروں پر اب بھی ماضی کے درخشندہ کارناموں کا نور بکھرا ہوا ہے اور ان کے تھکے ہوئے چہروں کی جھریوں پر بیتے دنوں کی عزم و ہمت کی داستانیں تحریر ہیں۔ ان کی مجبور زندگی کی کہانیاں افسوسناک بھی ہیں اور ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ بھی۔

گلگت کے پہلے صدر شاہ رئیس خان سے ملاقات ہوئی تو تحریکِ آزادی کا وہ بوڑھا سپاہی ماضی کی روشن قندیلوں کے سہارے علاقے کے بہتر مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اِسلام اور پاکستان سے لازوال محبت کا خزانہ دل میں چھپائے خلوص و وفا کے اس پُتلے نے جب آزادی کی داستان سُنائی تو آنکھیں کئی بار نم ہوئیں ـــ وہ پندرہ دن گلگت کے سربراہ رہے۔ اِس دوران انھوں نے انتہائی سختی سے لُوٹ مار کو روکے رکھا لیکن عالم خان کے پہنچنے پر سولہ سترہ نومبر کو غیر مسلموں کی اِملاک لوٹ لی گئیں۔ شاہ رئیس خان کو پتہ چلا تو عالم خان سے ملے اور کہا " یہ پاکستان کو لُوٹا گیا ہے اور آپ خُدا کے سامنے اس کے لیے جواب دہ ہوں گے۔"

کیپٹن بابر چوڑے چکلے سینے اور نکلتے ہوئے قد کا وجیہہ سپاہی تھا۔ کھلتی ہوئی سُرخ و سفید رنگت، بلوریں آنکھیں اور گھنی مونچھوں سے سجا باوقار چہرہ۔ وہ ۱۹۵۳ء تک اپنے عوام میں موجود رہا، پھر خالقِ حقیقی سے جا مِلا۔ چُست لباس میں ملبوس، گردن پر سکارف لپیٹے، ہاتھ میں سٹک لیے، سپاہی کی باوقار چال کے ساتھ جب وہ گلگت کے بازاروں سے گزرا کرتا تو لوگ راہوں میں آنکھیں بچھایا کرتے۔

راہِ وفا میں شہید ہونے والوں کی ایک یادگار چنار باغ میں تعمیر کی گئی ہے۔ اِرد گرد چنار کے درخت ایستادہ ہیں۔ ان کے سُرخ سُرخ پھول اس لہو کی یاد دلاتے ہیں جو آزادی کے لیے بہایا گیا۔

یکم نومبر ہوتا تو ہم بھی گلگت میں ہونے والے جشنِ آزادی میں شریک ہوتے۔ اِن جانبازوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے، جنھوں نے اپنے لہو سے وفاؤں کی لاج رکھی۔ لیکن یہ اگست کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ ہمارے گلگت پہنچنے کی اطلاع بریگیڈ کو پہنچا دی گئی تھی ہم منزل پر پہنچنے کے لیے بے تاب تھے اور بریگیڈ کے افسر ہماری آمد کے منتظر۔ رات ہم نے ایف سی این اے ہیڈ کوارٹر میں بسر کی اور صبح سویرے روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

فرمائشوں کے رنگ

ہمیں اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے لیے جس جیپ میں جگہ ملی، وہ میل سروس MAIL SERVICE کی جیپ تھی۔ فوج کے محکمۂ ڈاک کی جیپ۔ لگے ہاتھوں ذرا شہری ڈاک کی تقسیم کا حال بھی سُن لیجیے۔

شمالی علاقوں میں زندگی ابھی تک مُغلیہ دور سے گزر رہی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ پچھلے دور سے۔ ڈاک کی تقسیم کا اِنتظام بالکل ابتدائی شکل میں ہے۔ ہر چھ چھ میل پر ایک ہرکارہ مقرر ہے۔ ہر ہرکارے کی ڈیوٹی صرف چھ میل کے درمیان ہی ہوتی ہے۔ صبح سویرے دو چوکیوں کے درمیان کے ہرکارے ایک دُوسرے کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ "مقامِ وصال" پر ملتے ہیں۔ نیک خواہشات اور ڈاک کے تھیلوں کا تبادلہ کرتے ہیں اور واپس کوُچ کر جاتے ہیں۔ چھ چھ میل سفر کرنے کے بعد انھیں دُوسری چوکیوں کے ہرکارے مِلتے ہیں، ڈاک کے تھیلے ان کے حوالے کیے جاتے ہیں اور یوں تمام دن ڈاک کا یہ سفر جاری رہتا ہے۔ بارش ہو آندھی آئے، اولے گریں یا برف ـــ محکمۂ ڈاک کے یہ جفاکش کارندے اپنی آمد و رفت جاری رکھتے ہیں اور یوں ملنے کے تمنائیوں کے لیے آدھی مُلاقات کا اِنتظام کرتے رہتے ہیں۔

برسات کے دِنوں میں یہ معمول کی بات ہے کہ ایک پُورے کا پُورا پہاڑ اپنی جگہ سے کھسک کر سڑک پر آن براجتا ہے۔ اصطلاحاً اسے لینڈ سلائیڈنگ LAND SLIDING کہتے ہیں ـــ اِس سے بھی زیادہ خطرناک مصیبت ایوالانچ ہے جسے مقامی زبان میں "لانی" کہتے ہیں۔

موسمِ سرما میں بھربھری مٹی کے پہاڑوں پر جب برف زیادہ جمع ہو جاتی ہے تو نازک اندام مٹی سے یہ بوجھ برداشت نہیں ہو پاتا، وہ پہلو بدلتی ہے اور ڈھلوانوں کے حساب سے یہ تمام کی تمام برف ایک خوفناک شور کے ساتھ نیچے کی طرف بہہ نکلتی ہے۔ چٹانوں کی ڈھلوانوں کے مطابق اس کی رفتار ستر سے ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ تک ہو سکتی ہے۔ اس کے راستے میں آنے والی ہر چیز تہس نہس ہو کر اسی میں گم ہو جاتی ہے۔ گھنے پھلدار درخت، معصوم شاداب پودے، محنت سے اُٹھائے گئے فصلوں کے ڈھیر، بڑے بڑے چٹانی تودے، ٹیلیفون کی تاروں کے کھمبے، کچے پکے مکان، خستہ حال جھونپڑیاں، گھاس چرتے مویشی یا گھروں کو لوٹتے بدقسمت راہ گیر۔ جو بھی اس کی زد میں آ جائے چشم زدن میں غائب ہو جاتا ہے۔ کڑکتی بجلیوں کی سی آواز اور طوفانی جھکڑوں کی رفتار سے چلتا کوئی ایوالانچ جہاں سے گزر جائے تباہی و بربادی کی ایک داستان چھوڑ جاتا ہے۔ سڑک عنقا ہو جاتی ہے، درخت غائب، مکانات مِٹ جاتے ہیں، فصلیں اُجڑ جاتی ہیں اور انسان ویران ہو جاتا ہے۔ بس دُور تلک برف اور کیچڑ کا ایک وسیع دریا دکھائی دیتا ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے دریا کی گہرائیوں میں اُتر گیا ہو۔ کبھی کبھار یُوں بھی ہوتا ہے کہ ایوالانچ اتنا زبردست اور اس کے ساتھ بہنے والی برف اور کیچڑ کی مقدار اِس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ دریا میں جا کر یہ دریا کا بہاؤ ہی روک دیتی ہے۔ دائیں بائیں سے نکلنے کا راستہ مِل جائے تو فبہا ورنہ پانی جمع ہو کر ایک وسیع جھیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی اِردگرد کے لوگوں کے لیے نعمتِ خُداوندی بن جاتا ہے اور یوں بظاہر ایک آفت، رحمت میں بدل جاتی ہے۔

کہتے ہیں اگر کوئی شخص لانی کی زد میں آ جائے تو بھاگنے کے بجائے اسے فوراً منہ کے بل زمین پر لیٹ جانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ وہ زمین کے ساتھ چپکا رہے اور لانی اس کے اوپر سے گزر جائے ـــــ یا پھر برف میں پھنس جانے کے بعد بھی اگر کسی کے ہوش و حواس قائم رہیں تو اسے اپنے ہاتھ سر سے بلند رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ممکن ہے برف کا سفر رُک جانے پر وہ اُوپر کی سطح کے قریب ہو اور اس کے ہاتھ برف سے باہر نکلے رہیں

اِس صُورت میں اِمدادی پارٹیوں کی نظر میں آ جانے کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ ہم نے جب یہ تدابیر سُنیں تو پہلا خیال یہی گزرا کہ چچا غالب کا بھی اِن علاقوں سے یقیناً گزر ہُوا ہوگا اور لانی کی تباہ کاریاں جاننے کے بعد جب انھیں یہ حفاظتی تدابیر بتائی گئی ہوں گی تو انہی کے بارے میں انھوں نے کہا ہوگا ؎

دِل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
ورنہ ایں خیال است و محال است و جنوں

بات ہو رہی تھی شمالی علاقوں میں راستوں کی دُشواریوں اور ڈاک کے کارندوں کی ـــ جب لانی آتی ہے تو تمام ذرائع آمد و رفت مسدُود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جیپوں پر مشتمل ٹریفک اِدھر کی اِدھر اور اُدھر کی اُدھر رُک جاتی ہے۔ ذرائع مواصلات درہم برہم اور سڑک ٹُوٹ پھُوٹ کر مِٹ جاتی ہے۔ لیکن ڈاک کے یہ کارندے برفانی کیچڑ کے اُوپر سے گزر کر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔

سوچا جائے تو ڈاک کے تھیلوں کا سفر جاری رکھنے میں ان خطوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے جن میں معصوم آرزوئیں مچلتی ہیں۔ کسی میں باپ کی شفقت، کسی میں ماں کا پیار، کسی میں بیٹوں کی فرمائشیں، کسی میں بیٹیوں کے دُکھ، کسی میں چھُٹی لے کر جلد گھر آنے پر اصرار، کسی میں نہ آنے کی مجبُوری کا اظہار، کسی کے لیے خُوبصورت تحفے، کسی کے لیے محض خیریت بھرا اسلام، کسی کو کِرچی کِرچی کر دینے والے درشت الفاظ اور کسی ٹوٹتے، ڈوبتے شخص کے لیے پیار بھرے لہجے میں میٹھے بول۔ کبھی پلکوں میں جھلملا جانے والی خُوشیوں کے پیام اور کبھی آنکھوں کو آنسوؤں سے لبریز کر دینے والے دُکھ بھرے خط ـــــ یقیناً خُدا سے اپنی منزلوں تک پہنچنے کے لیے دُعا گو رہتے ہیں اور اس کی جناب میں مستجاب ٹھہرتے ہیں ورنہ ان پہاڑی راستوں پر، ان طوفانی ہواؤں میں، ان کا سفر کیوں کر جاری رہے۔

جب درجۂ حرارت نُقطۂ انجماد سے نیچے گِر جاتا ہے اور گرا ہی رہتا ہے، چٹانوں پر بل کھاتے راستے برف کی سپیدیوں تلے گم ہو جاتے ہیں تو کچھ منچلے ہرکارے سکی انگ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(SKIING) کا سہارا لیتے ہیں۔ ڈاک کے تھیلوں کو گردن میں حمائل کرتے ہیں اور خود آٹھ فٹ لمبی، چار اِنچ چوڑی لکڑی کی ان کھپچیوں پر سوار ہو جاتے ہیں جو انھیں میلوں بھگائے لیے جاتی ہیں، گولی کی رفتار سے۔

یہ تو ہُوا ڈاک کا شہری اِنتظام۔ فوجیوں میں ڈاک کی تقسیم کے لیے مختلف علاقوں کے درمیان مقرّرہ دِنوں میں جیپیں چلتی ہیں جو لینڈ سلائیڈنگ یا لانی آنے کی صُورت میں ظاہر ہے رُک جاتی ہیں۔ شہری ڈاک کے کارندے کاندھوں پر تھیلے اُٹھائے ان جیپوں کو دیکھتے ہیں اور ہنستے مسکراتے ہاتھ ہلاتے آگے نکل جاتے ہیں۔

حالات معمول پر ہوں اور ڈاک گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی ہو تو مسکرانے کی باری فوجی ڈرائیوروں کی ہوتی ہے لیکن اکثر و بیشتر وہ ان کارندوں کو بھی جیپ میں بٹھا لیتے ہیں اور یوں فوجی و شہری محکمے غیر سرکاری طور پر باہم مدغم ہو جاتے ہیں۔

ہماری خُوش قسمتی تھی کہ جب گلگت پہنچے تو برفانی طوفانوں اور لینڈ سلائیڈنگ کے موسموں میں ابھی دیر تھی چنانچہ جیپ مِل گئی ورنہ پاپیادہ ہی روانہ ہونا پڑتا۔

صُبح اُٹھے تو میل سَروس کی جیپ سفر کے لیے تیار تھی۔ ڈاک کے علاوہ اس میں فرمائشی سامان ٹھونسم ٹھانس بھرا ہُوا تھا۔ بلکہ اصل سامان تو یہ فرمائشی سامان ہی تھا۔ ڈاک کا تھیلہ بیچارہ "ربلوکٹا" بنا، ایک کونے میں دبکا پڑا تھا۔

ایک تو یہ فرمائشیں انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتیں۔ کبھی گل بکاؤلی کے ایک پھول کی فرمائش کئی شہزادوں کی جان لے بیٹھی، کبھی نکہت و نُور کی کوئی شہزادی لاکھوں پھُولوں کو مسل کر ان کے عرق سے غسل کیا کرتی ـــ کبھی کوئی سوداگر پردیس جانے سے پہلے بیوی بچّوں سے ان کی فرمائش معلوم کرتا تو سب سے چھوٹی بیٹی کسی سیاہ گلاب کی فرمائش کر دیا کرتی۔ تجارتی لین دین کے بعد سوداگر مہینوں سیاہ گلاب کی تلاش میں دشت نوردی کیا کرتا ـــ یوں ہر نئے موڑ پر نئی کہانیاں جنم لیتیں اور زندگی کے رنگ اور رنگین ہو جایا کرتے۔ اب تو مال لاد کر پردیس جانے والے سوداگر خال خال ہی رہ گئے، جو رہ گئے ہیں انھیں بیوی بچّوں سے فرمائشیں پوچھنے کی فرصت کہاں۔

ایک چھوٹا سا بریف کیس لیے نگر نگر گھُومتے ہیں۔ ناشتہ زمین پر کرتے ہیں تو لنچ فضاؤں میں ـــ مسکراہٹیں تو کاروباری معاملات میں بکھیر آتے ہیں، تفکرات کی شکنیں لیے گھر لوٹتے ہیں تو بچّوں کو خبر ہوتی ہے نا بیوی کو کہ یہ کیا کر آئے، کہاں ہو آئے۔ معصوم بیویاں وفاؤں کی دیویاں، دِل مسوس کر رہ جاتی ہیں، بچّے گُم سُم رہتے ہیں، کیا جانیں باپ کی شفقتیں کیا ہوتی ہیں، کِن پر نچھاور ہوتی ہیں۔

ہاں فرمائشی فہرستیں آج کل ان گھروں میں بڑے اہتمام سے مرتّب کی جاتی ہیں جہاں کے بیٹے عرب ملکوں میں مزدوری کرنے گئے ہوں۔ پیچھے رہ جانے والے ہر ماہ تنخواہ کی کھینچا تانی میں لگے رہتے ہیں لیکن ریڈیو، ٹی وی کے اشتہار ہیں کہ گھر والوں کو نئی نئی فرمائشیں سجھاتے رہتے ہیں، بجٹ تلپٹ کرتے رہتے ہیں۔

ویسے بالی عمریا کی بیگمات، بڑی عُمر کے شوہروں سے اور لاڈلے بچّے بوڑھے والدین سے جو فرمائشیں کرتے ہیں، ان میں مچلتے اَرمانوں اور معصُوم آرزوؤں کا حسین رنگ شامل ہوتا ہے، کچی عمروں اور اُٹھتی جوانیوں کے درمیان دھاگے سے جو رِشتے استوار ہوتے ہیں، ان میں چاہتوں کی علامتوں کے رنگ تو تیکھے ہوتے ہیں لیکن فرمائشیں بڑی سادہ سی ہوتی ہیں۔ فرشتوں کی سی معصومیت رکھنے والے یہ لوگ پھول چھپانے کو خوبصورت سی اِک کتاب، دِل کی دھڑکنیں لکھنے اور لِکھ لکھ کر پھاڑنے کو نفیس نفیس سے قلم، یادیں سلگائے رکھنے کو مدھم مدھم سی کسی خُوشبو، گلے کے حسین لاکٹ، یا محض تازہ کلیوں کے کسی گجرے پر، کسی جُوڑے پر، نہ صرف بہل جاتے ہیں بلکہ ان تحفوں کو زندگی بھر کا سرمایہ جان کر عزیز رکھتے ہیں۔ تازہ کلیوں کے یہ گجرے کہ جن کی خُوشبو نازک کلائیوں کی نبضوں کی راہ دِل کی دھڑکنوں میں اُتر جاتی ہے اور زُلفوں کی مہکاروں میں رَچ بس جانے والے یہ جُوڑے سرمایۂ حیات سمجھے جاتے ہیں، تمام عمر یاد رکھے جاتے ہیں۔ اور ان کی تازگی کی مہک کوئی ان کے دِل سے پُوچھے کہ جن کی کتابوں سے سُوکھے ہُوئے پھُول مِلا کرتے ہیں، جو تحفوں میں پھُول دیا کرتے ہیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

جس جیپ میں ہم سفر کر رہے تھے، اس کا فرمائشی سامان ان تمام فرمائشوں سے قطعاً مختلف تھا۔ اس میں پھول تھے تو گوبھی کے، پیکٹ تھے تو ڈبل روٹی کے۔ تھیلیں تھیں تو اچار کی اور ٹوکریاں تھیں تو پیاز کی۔ کپڑے دھونے کو صابن، رنگ نکھارنے کو (کپڑوں کا) نیل اور ٹیکو، جوتے چمکانے کو پالش کی ڈبیاں اور اندھیری راتوں میں راہ سجھانے کو بیٹری سیل، دالوں کے لفافے، سبزیوں کی گٹھڑیاں اور اسی طرح کی روزمرہ کی ضروریات کا سامان ——— اور اس سارے سامان کے بیچوں بیچ ایک سپاہی سکڑا بیٹھا تھا۔

تنہائیوں کے دُکھ

استور پہنچے تو رات کا ایک پہر بیت چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے فضا میں سردی کی کاٹ بڑھ گئی تھی۔ تمام افسر میس میں دبکے ہوئے تھے۔ جیپ کی آواز سن کر ایک کیپٹن باہر آئے، بخیریت پہنچنے پر مبارک دی اور میس کا رُخ کیا۔ ہم نے اپنے حلیے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے براہِ راست میس میں داخلے سے معذرت چاہی جو مسترد کر دی گئی۔ کیپٹن بابر نے بتایا کہ اس حلیے میں رہنا اس علاقے کا معمول ہے کوئی معترض نہ ہوگا، نہ نکتہ چیں بس چلیں اندر، سردی زیادہ ہے سو اسی حلیے میں یعنی کیچڑ میں لت پت جوتوں، بھیگی وردی اور سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہم میس میں داخل ہو گئے۔

میس کیا تھا تقریباً ۱۴×۱۰ فٹ کا ایک کمرہ جس کی ایک جانب کھانے کی میز لگی تھی اور دوسری جانب ایک صوفہ اور چند کرسیاں جن پر چار یا پانچ افسر براجمان تھے۔ سب نے نہایت تپاک سے خیرمقدم کیا۔ عمر، چہرے کے وقار اور اندازِ گفتگو سے فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ ہماری بائیں جانب برگیڈ کمانڈر بریگیڈیر داؤد احمد تشریف فرما تھے۔ باقی افسروں سے تفصیلی تعارف بعد میں ہوا۔ سارے دن کے تھکے ہارے تو تھے ہی، کھانا کھا کر بتائے گئے کمرے میں جا کر سو گئے ——— سو کر اٹھے تو استور میں ہماری پہلی صبح تھی۔

استور کا گلگت سے زمینی فاصلہ تو اسّی میل کے لگ بھگ ہو گا، لیکن زندگی کی دوڑ میں وہ ان دنوں بہت پیچھے تھا۔ جدید زندگی جن آسائشات سے عبارت تھی ان کا وہاں تصور نہ تھا۔ شہروں میں جو چیزیں بنیادی ضرورتیں کہلاتی ہیں، وہاں آرزوؤں کے دھندلکوں میں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لیٹی عیاشیاں نظر آتیں۔

رات کے کھانے پر ہم نے آلو مٹر کھائے تھے دُوسرے دن دوپہر کے کھانے پر بھی آلو مٹر نظر آتے۔ سوالیہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، کمانڈر سمیت سبھی افسر سر جھکائے کھانے میں مصروف تھے۔ چپکے ہو رہے لیکن بعد میں مَیس حوالدار کو طلب کیا اور اس سے وضاحت چاہی کہ دونوں دنوں میں ایک ہی کھانا کیوں؟ اس کا جواب تھا:

"سر! کل آلو مٹر پکے تھے! آج مٹر آلو پکائے ہیں کہیں تو کل انھیں پکانے کی بجائے فرائی کر دیں آپ کے لیے؟"

مزید انکوائری پر معلوم ہُوا کہ کھانے پینے کی اشیاء میں تو صرف ڈبوں میں بند مٹر ہیں اور آلو بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے قریب ایک قطعۂ زمین پر بریگیڈ میجر نے آتے ہی کاشت کروا دیے تھے۔ بازار میں کوئی چیز ملتی نہیں۔ سپلائی میں (ڈبوں میں بند) پالک بھی موصول ہوگا، لیکن فی الحال مٹر اور آلو ہی ہیں۔

تب ہمیں اشیاء کے ان تبادلوں کی اہمیت سمجھ میں آئی جو بونجی میں ہماری جیپ کے ڈرائیور اور وہاں کے سپاہیوں کے درمیان ہُوئے تھے اور جنھیں دیکھ دیکھ کر ہم دانت پیستے رہے تھے۔ "لیکن ہم کچھ سبزیاں بھی تو لائے تھے انھیں کیوں نہیں پکاتے؟"

اس گمبھیر صُورتِ حال میں ہم نے جھٹ ان تبادلوں کو اون OWN کر لیا۔

"سر! وہ پوسٹ مین سے غلطی ہوگئی۔ وہ رات کے اندھیرے میں سبزیوں کا تھیلا پچھلی چوکی پر دے آیا ہے اور ان کی ڈاک کا تھیلا یہاں لے آیا ہے ——— بندہ گیا ہے آج لے آئے گا وہ سبزیاں۔"

گوشت ——— دِل کے دوست کے بارے میں معلوم ہُوا کہ موسمِ سرما میں زندہ جانور رکھنے کی عیاشی تو کی نہیں جا سکتی کہ انسانوں کے لیے سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ جانوروں کا چارہ کہاں سٹاک کرتے۔ چنانچہ سردیوں کے آغاز ہی میں تمام جانور ذبح کر کے اور کھال آتار کر ایک بڑے کمرے میں لٹکا دیے جاتے ہیں۔ اکتوبر، نومبر میں ذبح کیے ہُوئے جانور مارچ اپریل تک

کھائے جاتے ہیں۔ پُوری وادی ڈیپ فریزر DEEP FREEZER میں بدلی ہوتی ہے، اس کے خراب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، سویلین آبادی میں بھی یہی طریقہ رائج ہے۔ گرچہ وہ ضرورت کے جانور اور ان کے لیے چارہ بھی سٹاک کرتے ہیں۔ لیکن سردیوں میں اِستعمال کے لیے گوشت کی ضرورت اسی طرح پُوری کی جاتی ہے کہ شرُوع سردیوں میں جانور ذبح کر کے لٹکا دِیے جاتے ہیں اور پُوری سردیاں کاٹ کاٹ کر کھائے جاتے ہیں۔ جوں جوں دن گزُرتے جاتے ہیں گوشت کی نمی اُڑتی رہتی ہے اور یہ سکڑتا چلا جاتا ہے۔ مقامی زبان میں اسے نسالچو کہتے ہیں۔ اب جانے یہ نسالچو کی خصوصیت تھی یا مَیس سٹاف کی مہارت کہ جس دن گوشت پکتا، کھانے کی میز پر آتے آتے اس پر گوشت ہونے کا صرف الزام باقی رہ جاتا، ہڈیاں زیادہ نمایاں نظر آتیں ——— وقت کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عجیب ناگوار بو سی آنے لگتی ہے اور اسے کھانا مشکل ہو جاتا ہے ———

مَیس میں روشنی کے لیے مٹی کے تیل کے گیس اِستعمال ہوتے۔ افسر اور جوان اپنے کمروں میں لالٹینیں جلاتے تھے۔

جوں جوں اسکور سے جنوب کی طرف جائیں، تہذیب اور جدید زندگی سے فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ گلتری اور شقمہ کے علاقے میں ایک درخت ملتا ہے جس کے تنے کی چھال لکھنے کے لیے اِستعمال کی جاتی ہے۔ یہ چھال کئی پرتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک کاغذ کے صفحے کے طول و عرض کے برابر چھال کاٹ لیں آپ کے ہاتھ میں کاغذ کا پُورا دستہ آگیا۔ لکھتے جائیں پرت اتارتے جائیں۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہُوا جب برف کی وجہ سے راستے مسدود ہو گئے اور ضروری سٹیشنری آگے نہ پہنچائی جا سکی تو اِس علاقے میں موجود یونٹ کمانڈر نے اسی درخت کی چھال کو بطور سٹیشنری اِستعمال کرنا شروع کر دیا۔ آئندہ کے لیے سٹیشنری کی ضروریات بھی اسی چھال کی پرتوں پر طلب کی گئی تھیں۔

جب ٹیلیفون کے تار نا کافی تھے تو دو علاقوں کے درمیان ٹیلیفون کے کھمبے گاڑ کر

تاروں کی بجائے خاردار تاریں ہی کھینچ دی گئیں۔ (یہی خاردار تار جو باغ کی باڑ وغیرہ کے لیے استعمال کی جاتی ہے) ان تاروں کے استعمال کے فنی پہلوؤں پر تو ماہرین ہی بحث کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے خود ان تاروں کے اس سرے پر واقع افسروں سے کئی بار بات چیت کی۔

ایک بار یو این او کے کچھ افسر اس علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ ڈرائیور پاک فوج کے سپاہی تھے ——— ایک افسر پہلے تو حیران ہو ہو کر کھمبوں پہ لگے ان خاردار تاروں کو دیکھتا رہا، سوچتا رہا، کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ٹوٹی پھوٹی زبان میں ڈرائیور سے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"سر! ہمارے اس علاقے میں برف بہت پڑتی ہے یہ سب درخت اس کے نیچے دب جاتے ہیں۔ تب راستوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ یہ تار کھمبوں پر اسی لیے لگایا گیا ہے کہ سردیوں میں رہنمائی ملتی رہے۔"

○

فوج نے ان علاقوں میں بڑی کسمپرسی کی حالت میں بھی وفاؤں کی لاج رکھی ہے۔ جدید زندگی کی تمام آسائشات سے محرومی انسان برداشت کر لیتا ہے لیکن تنہائی کا دکھ . . . .
. . . . .

○

انسان انسان کے ساتھ مل کر رہے تو بہلا رہتا ہے، خوش رہتا ہے لیکن کبھی کبھار ایسی کیفیات بھی آجاتی ہیں کہ سب کے ساتھ رہتا سہتا، سب کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا وہ تنہا رہ جاتا ہے۔ بات کسی سے کرتا ہے، دھیان کسی طرف رہتا ہے۔ بیٹھا کہیں ہوتا ہے، پہنچا کہیں ہوتا ہے۔ سامنے کوئی ہوتا ہے اور ذہن کے پردے پر تصویر کسی اور کی ابھرتی رہتی ہے، یہ تنہائی کے دکھ کی ابتدائی علامات ہوتی ہیں ——— پھر جب انسان کسی ایسے سے بچھڑ رہا ہو جس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے خوابوں سے زیادہ حسین، سپنوں سے زیادہ سہانے رہے ہوں اور جس کی بات بات پر دل کے تاروں میں جلترنگ بجتا رہا ہو تو یہ بچھڑنا قیامت کا بچھڑنا ہوتا ہے۔ تب بیتے ہوئے سارے لمحے، گزری ہوئی ساری باتیں، کہے ہوئے سارے بول آپس

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں، نمی کا غبار بن کر آنکھوں میں اتر آتے ہیں ——— انسان بھری محفل میں تنہا رہ جاتا ہے۔ سب کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا بھی اکیلا رہ جاتا ہے۔

اکیلے پن کا یہ دکھ بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ انسان کو کچھ دیکھنے دیتا ہے نہ سوچنے دیتا ہے، بس اندر ہی اندر اسے گھن کی طرح چاٹتا رہتا ہے۔ موسم کی آنکھ مچولیاں ہوں یا پھولوں اور کلیوں کی مسکراہٹیں، خزاؤں کے رنگ ہوں یا بہار کی شوخیاں، برسات کی پن پن ہو یا دمکتی شعاعوں کی لش لش، اس کی آنکھوں میں اتر آئی نمی کا غبار اسے رنگوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ بس وہ اپنے اندر قید ہو جاتا ہے اور اس کی ذات کے قفل کی چابی بچھڑنے والا اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

○

شمالی علاقوں میں تنہائی اور اکیلے پن کا یہ دکھ بڑی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ اپنوں کی رفاقت حاصل رہے، ایسے اپنوں کی کہ جن سے انسان دل کا دکھ کہہ سکے، سن سکے تو تنہائی کے لمحے مختصر ہو جاتے ہیں لیکن مونس ملے نہ ہمدم، غمگسار ہو نہ ہم راز تو اکیلے پن کا یہ دکھ دل کا روگ بن جاتا ہے۔

اپنوں سے بچھڑ کر تیرہ ہزار سے سترہ سترہ ہزار فٹ بلند برف پوش پہاڑوں پر رہنا، جہاں سبزہ ہو نہ طراوت، جلوت ہو نہ رفاقت، بڑے دل گردے کا کام ہے ؎

انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

لیکن انسان انسان ہے دھات سے بنی مشین نہیں ہے، جہاں رکھ دی، رکھی رہی۔ اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے جو اپنوں کے لیے مچلتا ہے۔ جدائی کے غم میں تڑپتا ہے اور محض خاکی وردی پہن لینے سے اس کی دھڑکنیں اپنوں سے بے نیاز نہیں ہو جاتیں۔

ایک زمانہ تھا جب اگلے مورچوں پر چھوٹی چھوٹی پوسٹیں ہوتی تھیں۔ ایک پوسٹ پر ایک افسر ہی ہوا کرتا۔ دوسرے افسروں سے رابطہ فیلڈ ٹیلیفون کے ذریعے ہوا کرتا۔ استور سے بھی بہت آگے ایک جگہ کا ذکر ہے۔ ایک چوکی پر متعین ایک افسر نے

اپنی مدتِ ملازمت جو ان علاقوں میں ایک خاص میعاد تک ہوتی ہے، پوری کر لی۔ دورانِ قیام وہ خوش و خرم رہا، ہشاش بشاش۔ اداسیوں کو قریب بھی نہ پھٹکنے دیا لیکن پوری گرمیاں جب نئی تعیناتی کی خبروں کے انتظار میں گزریں تو لبوں پر چپ لگ گئی۔ سردیاں آئیں، چاروں طرف برف نے ڈیرے ڈال دیے۔ برف، برف، برف ہی برف، بلند و بالا درخت تک بیسیوں گز برف کی تہ تلے دب گئے۔ جن لوگوں نے برف دیکھی ہے، برف میں رہے ہیں، جانتے ہیں کہ جب چاروں طرف برف پڑ جاتی ہے تو خاموشی کتنی اداس لگتی ہے۔

خاموشیاں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ علم کے وقار کی خاموشی، " وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الجاهلون قالوا سلامًا کی تفسیر، تکبر کی خاموشی، جبینِ پرغرور پر نفرت کی شکنیں لیے ہوئے، بےکسی، بےبسی کی عرق آلود حیران، پریشان خاموشی، مصلحت کی سوچتی ہوئی چپ خاموشی اور حیا کی باتیں کرتی، بولتی، مسکراتی خاموشی، موسمِ گرما کی تپتی دوپہروں میں سنسان گلیوں اور بارانی کھیتوں کی اونگھتی خاموشی، چھوٹے چھوٹے دیہاتی سٹیشنوں سے پسنجر ٹرین گزر جانے کے بعد کی خاموشی، اکلوتی بیٹی کو رخصت کرنے کے بعد بھائیں بھائیں کرتی گھر کی خاموشی، سہاگ رات کو مخصوص آہٹوں کی منتظر دلہن کی دھڑکتی خاموشیاں، میدانِ جنگ کی پراسرار بھیانک طوفانوں کا پیش خیمہ خاموشی، ہسپتال کے ملگجے وارڈوں کے مدھم اندھیروں میں کانپتی، لرزتی خاموشی، دم توڑتے مریض کی طرح مدھم لرزتی نبضوں سے ابھرتی آخری ارتعاش کے بعد ہمیشہ کی خاموشی اور رات کے پچھلے پہر کی خاموشی جس کے اسرار کوئی کوئی جانتا ہے، کوئی کوئی پہچانتا ہے۔

برف کی خموشیوں میں بہت سی خاموشیوں کے اسرار ملے ہوتے ہیں۔ اس کی خاموشی اتنی گہری اور پراسرار ہوتی ہے کہ ہر ذہنی کیفیت کے ساتھ منطبق ہو جاتی ہے۔ اس میں من کی خموشی مل جائے تو انسان جیتے جی مر جائے۔ اس کا مقابلہ پرعزم مسکراہٹوں، جینے کی بے تاب تمناؤں اور ہنستے کھیلتے گیتوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ مسکراہٹیں بھول جائیں تو برف کی خموشیاں زہر بن کر رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہیں۔

یہ ہنستا گاتا افسر اداس ہوا تو خموشیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ میل سروس MAIL SERVICE

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کا ہیلی کاپٹر آتا تو اس کا کلیجہ بلیوں اچھلنے لگتا کہ ڈاک کے تھیلوں میں نئی جگہ تعیناتی کی خبروں کی امید ہوتی لیکن ہیلی کاپٹر واپس جاتا تو اس کی تمناؤں کے سارے رنگ بھی سمیٹ لے جاتا۔

ساری سردیاں اس نے انتظار میں گزار دیں۔ ان علاقوں کی سردیاں بہت طویل ہوتی ہیں۔ موسم سرما وقت سے بہت پہلے آ جاتا ہے اور دیر تک ٹھہرتا ہے بلکہ ٹھہرا ہی رہتا ہے۔ جون جولائی میں جب سورج جلال میں ہو تو کونوں کھدروں میں چھپ جاتا ہے۔ سورج غروب ہونے پر پھر وادیوں میں دندناتا پھرتا ہے۔ ایسے موسم پر موسم گرما ہونے کا محض الزام ہوتا ہے جس کی واحد نشانی یہ ہے کہ برف پگھل جائے اور ندی نالوں کا پانی نشیب کی طرف بہہ نکلے ——— برف پگھلی ——— لیکن افسر کی ساری تمنائیں منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔

اس کے صوبیدار نے سگنل دیا کہ صاحب کی حالت سخت خراب ہے۔ ہیلی کاپٹر گیا اور اسے ہیڈ کوارٹر لے آیا۔ اس کی عجیب حالت تھی، جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ، شیو بڑھی ہوئی، آنکھیں دھنسی ہوئی جن کی پتلیوں میں سارے جہاں کی ویرانیاں سمٹ آئی تھیں ہر سوال کے جواب میں وہ خاموش رہتا۔ بہت اصرار کیا جاتا، "کچھ بولو، کچھ بتاؤ۔ کہاں کھو گئے ہو؟"

تب وہ اچانک پھٹ پڑتا، "ایک، دو، تین، چار . . . . . . گیارہ، بارہ، تیرہ" تیرہ پر آ کر وہ یک دم رک جاتا، مسکراتا اور سوال کرنے والے کو یوں دیکھتا جیسے کوئی شگفتہ جواب دے کر داد کا طالب ہو۔

اسے سی ایم ایچ راولپنڈی بھجوا دیا گیا۔ جہاں ماہرینِ نفسیات مختلف پہلوؤں سے اس کی بیماری کی تشخیص میں کوشاں رہے لیکن وہ ہر بات کے جواب میں ایک سے تیرہ تک گنتی گنتا اور چپ ہو رہتا۔ تب ایک ڈاکٹر کو اسی چوکی پر بھیجا گیا جہاں افسر تعینات تھا کہ تیرہ نمبر کی علت کا پتہ چلائے۔

○

بے چارے ڈاکٹر نے علاقے کے کونے کونے کا معائنہ کیا۔ سبھی لوگوں سے

سوال جواب کیے۔ اس کے یونٹ کا نمبر، یونٹ میں مختلف ہتھیاروں کی تعداد، اس کے زیرِ کمان افراد، اس کی چوکی سے مختلف جگہوں کے فاصلے، علاقے کی سطحِ سمندر سے بلندی، اس کی تاریخِ پیدائش، مختلف یونٹوں میں گزارے ہوئے مہ و سال، رشتہ داریاں۔ کیا کچھ نہ زیرِ غور آیا لیکن ایک سے تیرہ تک گنتی کا تعلق کسی سے بنتا نظر نہ آیا۔ سارا دن اسی تگ و دو میں گزر گیا۔ رات گزارنے کے لیے ڈاکٹر کو اسی کمرے میں ٹھہرایا گیا جہاں افسر مقیم تھا۔ سارے دن کا تھکا ہارا ڈاکٹر پڑتے ہی سو گیا۔

صبح اٹھا، اس نے لحاف سے منہ نکالا تو چھت پر نگاہ پڑی۔ تیرہ کا ہندسہ اس کے ذہن سے چپک گیا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر چھت کی کڑیاں گننا شروع کر دیں اور . . . . وہ اچھل پڑا۔ چھت کی کڑیوں کی تعداد تیرہ تھی۔ ڈاکٹر اسی دن لوٹ آیا۔ مریض افسر کے ذہن میں یہ بات ثبت ہو گئی تھی کہ ساری کائنات بس ان تیرہ کڑیوں پر محیط ہے۔ ہر بات ایک سے شروع ہوتی ہے، تیرہ پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ صحیح تشخیص آدھا علاج ہے۔ کچھ دنوں بعد افسر بھلا چنگا ہو کر نئے یونٹ کو سدھار گیا۔

ایک اور افسر اسی طرح کے خاموش اور تنہا علاقے میں متعین تھا۔ اس کی ملازمت کی میعاد موسمِ گرما میں پوری ہو گئی تھی۔ جب چاروں طرف سبزہ لہلہا اٹھتا ہے، پھولوں رنگوں اور خوشبوؤں کا ایک سیلاب امڈ آتا ہے اور فضا میں ہوائیں گنگناتی پھرتی ہیں۔ وہ خوش تھا کہ اس موسم میں واپسی کا سفر خوشگوار رہے گا۔ ہرکاروں کی آمد پر اس کی حالت دیدنی ہوتی۔ بڑی امیدوں سے وہ ڈاک کھلواتا۔ چند لمحوں کے لیے اس پر اداسی طاری ہوتی لیکن پھر قہقہے بکھیرنے لگتا۔ "کبھی ہمارا بھی کوئی خط پتر لے آیا کرو بادشاہو!" وہ ہرکارے سے خوش دلی سے کہتا :

"سر! کوئی لکھنے والا ہو تو آپ کو خط آئے نا۔"

ہرکارہ جواب دیتا، بات قہقہوں میں اڑ جاتی لیکن جب ہواؤں کی گنگناہٹ غراہٹوں میں بدلنے لگی، پھول کملانے لگے، اور دھرتی کے سبزے پر خزاؤں کی

زردیاں کھنڈنے لگیں تو اس کے قہقہے بے بس خاموشیوں میں بدل گئے۔ اس نے کئی خط لکھے اور سوچا ؎

کیسے ہوتے ہیں وہ خط، جن کے جواب آتے ہیں

پہلی برفباری کے ساتھ ہی اس کی خموشیاں گہری اداسیوں میں بدل گئیں۔ آخر کار ہمارے ہاں ہیڈ کوارٹر میں اس کے تبادلے کے احکامات آ پہنچے۔ سگنل کے ذریعے اسے یہ خوشخبری سنا تو دی گئی لیکن ہمارے اور اس کے درمیان برف کی دبیز تہیں حائل تھیں۔ برف دبیز ہو جائے تو ایوالانچوں کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اور ایسے میں جیپوں کا استعمال تو دور کی بات ہے پیدل سفر کی بھی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ اشد ضرورت کے تحت ہیلی کاپٹر استعمال کیے جاتے ہیں۔

یقین دلایا گیا کہ ڈاک سروس کے لیے آنے والے ہیلی کاپٹر پر اسے واپس منگوا لیا جائے گا لیکن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے آٹھ دس افراد پر مشتمل ایک گشت پارٹی ہمراہ لی۔ صبح سویرے اپنی روانگی کی اطلاع دی اور پیدل ہی واپس روانہ ہو گیا چودہ ہزار فٹ ایک درّے (درّہ برزل) کو عبور کرنے کے بعد اسے تین میل دور ایک چوکی "چلم" پر پہنچنا تھا جہاں سے ہمیں اس کی آمد کی اطلاع ملتی، لیکن صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی لیکن روانگی کی اطلاع کے بعد اس کی کوئی خبر نہ آئی رات کے اندھیرے پھیلے تو کمانڈر کے چہرے پر تفکرات کی شکنیں گہری ہو گئیں۔ ہم سب میس میں جمع تھے۔ تھوڑی دیر بعد چلم چوکی سے رابطہ پیدا کرتے لیکن افسر کا دور دور پتہ نہ تھا۔ عشاء کے بعد کمانڈر نے احکامات جاری کیے کہ چلم سے دس افراد کی ایک پارٹی برف میں رات گزارنے کا ساز و سامان اور ایک ٹیلیفون سیٹ لے کر درہ برزل کی طرف روانہ ہو اور جہاں بھی گمشدہ افراد مل جائیں ٹیلیفون کی تاروں سے سیٹ کو ملا کر ہیڈ کوارٹر اطلاع دیں۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی، لیکن تلاش پارٹی کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ آیا۔ دوسرے دن دس بجے کے قریب اطلاع ملی کہ افسر گشت پارٹی سمیت ایک غار میں مل گیا ہے لیکن بیشتر افراد فراسٹ بائٹ FROST BITE

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کا شکار ہو کر بیٹ گئے ہیں۔

پہاڑی رستے عموماً دریاؤں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہوا یوں کہ جس رستے پر وہ آرہے تھے، ایوالانچ گرنے کی وجہ سے وہ مسدود ہو گیا تھا۔ افسر نے واپس جانے کی بجائے بائیں طرف کے اچھلے دریا میں سے گزر کر کوئی اور رستہ اپنانا چاہا لیکن دریا کے یخ بستہ پانی میں سے گزرنا قیامت ہو گیا۔ ایک دو کو چھوڑ کر باقی تمام افراد کو سردی نے کاٹ کھایا۔ کسی کا کان سُن ہو گیا تھا، کسی کی ٹانگ، کسی کی ہاتھوں کی انگلیاں بے جان ہو گئی تھیں کسی کے پیر کا پنجہ۔

یہ سُن ہو جانا اور بے جان ہو جانا اس طرح کا سُن ہو جانا نہیں ہے جو ایک ہی پہلو دیر تک بیٹھے رہنے سے ہوتا ہے اور جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی ہیں بلکہ یہاں پالے کے ہاتھوں جو عُضو مارا جائے۔ اس میں خُون کی گردش مستقل رک جاتی ہے۔ علاج میں تاخیر اس عضو کو کاٹ ڈالنے پر منتج ہوتی ہے۔

تو یہ سب لوگ بے یار و مددگار ایک غار میں لیٹے تھے ہنگامی بنیادوں پر مختلف سمتوں سے مختلف پارٹیاں روانہ کی گئیں، کوئی دوائیں لے کر بھاگا، کوئی کھانا لے کر لپکا۔ گلگت سے ہیلی کاپٹر بلوایا گیا اور زخمیوں کو درۂ برزل سے منگوا کر راولپنڈی سی ایم ایچ بھجوایا گیا۔ ان کے پاؤں سُوج سُوج کر کُپا ہو گئے تھے۔ ہیلی کاپٹر کی آخری پرواز سے افسر اسکردو پہنچا تو اس کے چہرے پر زردیاں بکھری ہوئی تھیں۔ جو کچھ ہوا تھا، اس سب کچھ کی جواب دہی اسی کو کرنا تھی۔

یہ سب کچھ زندگی کا ایک پہلو ہے۔ روشن پہلوؤں پر نظر رکھنے والے سیاہ رات کی بھیانک تاریکیوں کو سحر کی آمد کے آثار کہتے ہیں۔ محض گھٹی گھٹی ہوتی سانسوں کا نام زندگی نہیں ہے۔ یہ نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ دُکھ اور سُکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ کون ایسا ہے جو کہہ سکے کہ اس کی زندگی دُکھوں سے عاری ہے۔ دُکھ تو آتے ہی ہیں لیکن بیشک ہر دُکھ کے بعد سُکھ ہے۔ ہر مصیبت کے بعد راحت ہے۔ ہر تنگی کے ساتھ فراخی ہے

کانٹوں کے بالکل قریب پھول اگتے ہیں بلکہ کانٹے تو اپنی خشونت خود ہی تک محدود رکھتے ہیں۔ پھولوں کی مہک چاروں طرف بکھرتی ہے، ہواؤں کو معطر کرتی ہے اور دُور دُور تک پھیل کر تاآں بہ کرم رہتی ہے۔

انسان اپنے خالق کی انتہائی حسین تخلیق ہے، اس کی صلاحیتیں بے پایاں ہیں اور قدرتیں بے شمار۔ اسے زیب نہیں دیتا کہ ذرا ذرا سی مشکلات پر اس کی جبیں شکن آلود ہو جائے اور طبیعت پژمردہ۔ مسکراہٹ چاہے زبردستی ہی کی کیوں نہ ہو، اِنسان کی اداس کیفیتوں کو بدلتی ضرور ہے۔ غم کو بانٹنے والے ملتے بھی کہاں ہیں؟ رونے والوں کو رونا اکیلے ہی پڑتا ہے۔ ہنسنے والوں کا ساتھ دینے کو ایک خلقت بے تاب رہتی ہے۔ پس چاہیے کہ انسان مسکراتا رہے۔ ہمارا مذہب تو یہی ہے ؎

وفا کنیم و ملامت کشیم و خُوش باشیم
کہ در طریقتِ ما، کافریست رنجیدن

(وفا کرتے ہیں، ملامت پاتے ہیں پر خُوش رہتے ہیں کہ ہماری طریقت میں رنجیدہ ہونا کفر ہے کفر)

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

رنگ رلیاں

ہم نے جب دیکھا کہ شمالی علاقوں میں ؎

اداسی بال کھولے سو رہی ہے

تو اس کے پہلو میں لیٹنے کی بجائے فیصلہ یہی کیا کہ اسے جگایا جائے، ہنسایا جائے۔ پہاڑی علاقوں میں رہنے کا یہ پہلا تجربہ تھا اور ہمارے ذہنوں میں مرشد علامہ اقبالؒ کا یہ شعر گونج رہا تھا ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

صحرا کو ہم بہت نیچے چھوڑ آئے تھے سو کہستانی بننے کی ٹھانی۔ پہلا پروگرام یہی طے پایا کہ فارغ اوقات میں اِردگرد کے علاقے دریافت کیے جائیں۔ خوش قسمتی سے بریگیڈ میجر عبدالعزیز بھی کہستانیوں میں سے تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ دو دیوانے مل بیٹھیں تو گزران کو اچھی ہونے سے کون روک سکتا تھا — آفس سے واپس آتے، کھانا کھاتے اور نکل کھڑے ہوتے — کبھی دریائے استور کی ٹھیٹی میں اُتر جاتے۔ کناروں سے اس کی تہہ کوئی ایک ہزار فٹ تو ہو گی۔ کبھی بل کھاتے اونچے نیچے استول پر بھٹکتے پھرتے۔ میجر عزیز کا روسی نژاد چھوٹا سا کتا ہمارے ساتھ ہوتا، کبھی دُور دُور آگے نکل جاتا، کبھی بھاگ کر واپس آجاتا اور قدموں میں لوٹنے لگتا۔

اداسیوں کے خلاف جدوجہد میں دو گھوڑوں نے ہماری بہت مدد کی۔ ہوا یوں کہ میجر عزیز کسی کام سے گلگت سدھارے اور ہم اپنی آوارہ گردیوں میں تنہا رہ گئے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ایک دن سیر کے لیے نیچے اُترتے ہوئے یوں لگا جیسے کوئی گھوڑا ہنہنایا ہو۔ کان کھڑے ہوئے۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد پتہ چلا کہ عین بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کی بغل میں ایک اصطبل ہے۔ دو صحت مند گھوڑے تھان پر بندھے ہیں اور سائیس ان کی مالش کر رہا ہے۔ تفتیش پر معلوم ہوا کہ گھوڑے ہیڈ کوارٹر ہی کے تھے — سائیس پر سخت غصّہ آیا کہ اب تک اس نے ہمیں رپورٹ کیوں نہیں دی تھی۔ ہیڈ کوارٹر تلے گھوڑے نہ ہوئے، چراغ تلے اندھیرے ہو گئے۔

گھڑ سواری سیکھنے کا پرانا شوق عود کر آیا۔ یہ شوق ہمیں پی ایم اے میں بھی چرایا تھا لیکن وہاں حالات سخت ناسازگار تھے۔ ایک تو وہاں کے گھوڑے بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ جانوروں کے ساتھ انسانی سلوک روا رکھا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ پی ایم اے میں جو گھوڑے رکھے جاتے ہیں، بڑے ناز و نعم سے پالے جاتے ہیں۔ انھیں باقاعدہ سالانہ چھٹیاں ملتی ہیں اور سال کے چالیس دن یہ نواب زادے اس طرح گزارتے ہیں کہ اُن پر زین ڈالنا سرے سے موقوف ہوتا ہے۔ تھان پر کھڑے کھڑے راتب کھاتے ہیں، صاف ستھرے حوضوں سے شفاف پانی نوش فرماتے ہیں۔ صبح شام انھیں ٹہلائی کے لیے لے جایا جاتا ہے، اس شان سے کہ ہر گھوڑے کا سائیس اس کی ہلکی سی لگام پکڑے اس کے ساتھ ساتھ پاپیادہ چلتا ہے۔ فضا میں خنکی ہو تو ان پر کمبل ڈالے جاتے۔ ان ناز نخروں سے پلنے والے گھوڑے کیڈٹوں کو کیا گھاس ڈالیں۔ ہٹے کٹے گھوڑے کے ساتھ کھڑا دُبلا پتلا کیڈٹ یوں بھی بھیگی بلی نظر آتا ہے کہیں وہ قصدِ رکوب کر بیٹھے تو گھوڑوں کی وحشت دیدنی ہوتی ہے، ہنہناتے الگ ہیں، آنکھیں الگ نکالتے ہیں۔ بدتمیز کہیں کے، جنگلی۔

ہم نے کئی بار ان سے دوستی استوار کرنا چاہی، گڑ خرید کر ساتھ لے جاتے، سوار ہونے سے پہلے بڑی نیازمندی سے انھیں پیش کرتے، سواری کے دوران مستقل انھیں پچکارتے لیکن انھیں رام ہونا تھا نہ ہوئے۔ کبھی خواہ مخواہ کی اچھل کود شروع کر دیتے، کبھی گردن اونچی نیچی کر کے راسیں ہم سے

چھین لیتے ـــ ایک دفعہ ایک گھوڑا رائڈنگ سکول کا چھوٹا سا گیٹ پھلانگ کر ہمیں باہر کے کھلے میدان میں لے بھاگا۔ ہم ہنا پکڑے اس کی پُشت سے چپکے رہے اور وہ گراؤنڈ کے چاروں طرف زقندیں بھرتا پھرا۔ اس بڑے میدان میں ماہر گھڑسوار شہسواری کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک کیڈٹ کو سہما سہما گھوڑے سے چپکا دیکھا تو سب اپنے اپنے گھوڑے ٹھہرا کر ایک جگہ سمٹ گئے کہ بدکے ہوئے گھوڑے کو روکنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے اس کے ہم نفس گھوڑوں کی شرافت سے متأثر کرنے کی کوشش کی جاتے۔ گھوڑا بنیادی طور پر ایک تو شریف ہے، دُوسرے جانور ہے شرافت سے متاثر ہو جاتا ہے۔ یہ جو ہمیں لے کر سرپٹ دوڑ رہا تھا بالآخر سر جھکائے دُوسرے گھوڑوں کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو خود کو اس کی پشت پر اوندھا پایا۔ دیکھا کہ گھوڑا شرم سے پسینوں پسین ہو چکا ہے اور عرقِ انفعال کے قطروں سے ٹخنوں تک شرابور ہے۔ ہم سیدھے ہوئے تو خود کو سٹاف کا مخاطب پایا، "صاب! یہ کس کی اجازت سے آپ گھوڑا باہر لائے ہیں؟" حالانکہ یہ سوال گھوڑے سے کیا جانا چاہیے تھا کہ وہ کس کی اجازت سے ہمیں لے کر باہر آیا تھا۔ ہمارا تو ؎ "نے ہاتھ باگ پر تھا نا پا تھا رکاب میں"

حکم ملا کہ واپس رائڈنگ سکول جائیں۔ ہمیں خطرہ تھا کہ دُوسرے گھوڑوں سے الگ ہُوا تو پھر پہلے جیسا حشر کرے گا۔ ہم نے چھلانگ لگائی اور نیچے اُتر آئے اور اس کی باگیں تھامے، چلے سکول کی طرف ـــ سٹاف دہاڑا۔

"صاب! ماؤنٹ، اوپر ماؤنٹ۔" (سوار ہو جائیں، سوار ہو جائیں)

ہم نے بےکسی سے سرکش گھوڑے کی طرف دیکھا جس سے ہماری بےبسی دیکھی نہ گئی اور وہ باگیں چھڑا، بھاگ نکلا۔

ہم نے سوالیہ نظروں سے سٹاف کی طرف دیکھا، "اب کیا کریں؟"

"صاب! کیا دیکھ رہے ہیں آپ ـــ جائیں گھوڑا پکڑیں۔"

یعنی ہم اور گھوڑا پکڑتے ـــ جو دُور اصطبل کے گیٹ کی طرف مائل بہ پرواز تھا۔ لیکن سٹاف سے جان چھڑانی تھی ـــ سرپٹ بھاگے اور رائڈنگ سکول میں آ کر دم لیا۔ ـــ گھوڑا اصطبل میں جا چکا تھا۔ لیکن سکول کا سٹاف بالکل سوالیہ نشان بنا، گھوڑے پر تنا بیٹھا تھا۔ "صاب! گھوڑا کہاں چھوڑ آئے آپ؟" "ہم نے کہاں چھوڑا تھا گھوڑے کو۔ وہ ہمیں چھوڑ کر آیا تھا۔" بڑی مشکلوں سے جان خلاصی ہُوئی۔

ایک بار غلطی سے ایک انتہائی صحت مند گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ بلکہ سوار کہاں ہُوئے، ابھی آدھے رکاب ہی میں تھے کہ وہ الف ہو گیا۔ ابھی ابتدائی اسباق سے بھی واقفیت نہیں ہُوئی تھی۔ اس کی راسوں سے لٹک گئے۔ گھوڑا اپنا توازن کھو بیٹھا اور پیٹھ کے بل پیچھے کو گرا۔ ہم نیچے، وہ اُوپر۔ جانے صحیح سلامت کیسے رہ گئے ـــ اس کے بعد سے پی ایم اے کے گھوڑوں سے مُستقل کُٹی رہی۔

اب جو اتنے دِنوں بعد پھر سے گھوڑے نظر آئے تو ان کی نسل سے اِنتقام کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ حکم دیا کہ آئندہ روز سے روزانہ شام کو گھوڑے ہمارے حضور پیش کیے جایا کریں۔ اب کے ہمارا رویّہ نیازمندانہ نہیں جا رہا نہ تھا۔ دو تین دنوں ہی میں سواری کا ڈھب آ گیا۔ گھوڑوں نے بھی ہم سے صلح کر لی۔ ثابت ہُوا پائیدار صلح کے لیے محض اِلتجائیں کافی نہیں ہوتیں، کچھ قوت بھی درکار ہوتی ہے جسے بوقتِ ضرورت اِستعمال بھی کیا جانا چاہیے۔

ہیڈکوارٹر سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ایک پولو گراؤنڈ تھا اور گھوڑے اس گراؤنڈ کو خوب پہچانتے تھے کہ یہاں آتے ہی ان کی حالت مضطرب ہو جاتی۔ لاکھ روکیں، لاکھ ٹوکیں۔ وہ بجلی بن کر ہوا ہو جاتے اور سرپٹ دوڑنے لگتے۔ جب شدتِ تنفس سے ہانپنے لگتے تو ہم لوٹ آتے ـــ

لیکن ہماری دوڑ صرف پولو گراؤنڈ تک محدود نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ہم حسن کی تلاش میں نکلے تھے کہ ؎

حُسن جس رنگ میں ہوتا ہے، جہاں ہوتا ہے
اہلِ دل کے لیے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

اور اتفاق ہمیں ایسی جگہ لے گیا جہاں حُسن اپنے تمام تر جمال و جلال کے ساتھ جلوہ نُما تھا۔ اسنور سے تقریباً اٹھائیس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے رٹو۔ ہم نے ایجوکیشن کی کلاسیں چلانے کے لیے اِسی جگہ کا اِنتخاب کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ جوان دُوسرے کاموں سے نمٹ کر بلندیوں سے اُترتے، ہم نے مناسب جانا کہ رٹو کو ایک نظر دیکھ ہی لیا جائے، رہائشی سہولتوں کا جائزہ لے لیا جائے اور ضرورت کی چیزیں پہلے سے مہیا کر رکھی جائیں۔ کمانڈر سے ذِکر کیا تو انھوں نے بخوشی جانے کی اجازت دے دی۔ دُوسرے دن ایک جیپ میں رٹو روانہ ہو گئے۔ ابھی آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کر پاتے تھے کہ ایک اور جیپ سامنے سے آتی دکھائی دی۔ قریب آنے پر معلوم ہُوا کہ میجر ریاض بنگش ہیں۔ رٹو میں اِن دِنوں وہ واحد افسر تھے۔ پتہ چلا کہ چھٹی جا رہے ہیں۔ گویا ہماری میزبانی کے شرف سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے بہتیرا زور لگایا کہ اتنی بڑی چھاؤنی میں اکیلے جا کر کیا کرو گے، لوٹ چلو، پھر آنا لیکن یہ نگاہِ پُرتقصیر تھوڑا ہی تھی جسے پلٹا لیتے، قدم تھے، اُٹھے ہُوئے بڑھے ہُوئے، ہم نے میجر بنگش کو خُدا حافظ کہا اور سفر جاری رکھا۔

سرِشام رٹو پہنچے۔ نو ہزار فٹ کی بلندی پر واقع حسین سبزہ زاروں، مرغزاروں پر مشتمل یہ وادی دِلفریب نظاروں سے گھری ہوئی ہے۔ یہ تین راستوں کا سنگم ہے اور تینوں اطراف کا حُسن اس وادی میں سمٹ آیا ہے۔ ایک تو وہی راستہ ہے گلگت کی طرف سے آتا ہُوا، جس پر سفر کرتے ہُوئے ہم یہاں پہنچے تھے۔ دُوسرے رُخ، جنوب کی طرف دو وادیاں ہیں۔ ایک جنوب مشرق میں واقع ۱۳۴۸۵ فٹ درہ شونتر سے اُترتے اُترتے اس میں مدغم ہو گئی ہے۔ دُوسری وادی جنوب مغرب کی طرف کھلتی ہے اور ۱۳۲۳۲ فٹ درہ کامری تک بلند ہوتی چلی گئی ہے۔ دونوں وادیوں سے سرسراتی، گنگناتی ہوائیں چل رہی ہوں تو رٹو میں آ کر سفارتی آداب کے مطابق بڑے رکھ رکھاؤ سے ملتی ہیں، عربوں کی طرح معانقے کرتی ہیں۔ اور بڑی شائستگی کے ساتھ وادی میں بکھر جاتی ہیں۔ مقامی باشندوں کو یہ ملنا ملانا بھلا لگتا ہے کہ چہروں پر تازہ ہواؤں کا لمس

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

زندگی بخشتا ہے، معطر جھونکے سانس لینے کی، زندہ رہنے کی اُمنگ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اِن وادیوں کے سفیر سدا ایکساں مزاج کے نہیں ہوتے۔ چیختی چلاتی دیوانی ہوائیں بھی آتی ہیں اور رٹو میں آ کر ایک دُوسرے سے دست بگریباں ہو جاتی ہیں۔ تب سارا دن فضاؤں میں سیٹیاں گونجتی ہیں، خطرے کے سائرن بجتے ہیں اور لوگ باگ گھروں میں دُبک جاتے ہیں۔ دُور شمال مشرق میں نانگا پربت کی تکونی چوٹیاں مسکراتی رہتی ہیں۔

خُود وادی خاصی وسیع و عریض ہے اور اُونچے نیچے ٹیلوں پر مشتمل ہے جن پر گرمیوں میں گہری سبز گھاس کا مخمل بچھا ہوتا ہے اور سردیوں میں دودھیا برف کی بے داغ اجلی چاندنی — آفیسرز میس دفتروں سے الگ تھلگ کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر بنایا گیا ہے — جے سی اوز میس دفتروں سے بھی پرے ہے جن کے عین سامنے ایک وسیع میدان ہے اور اس کے دُوسرے کنارے پر جوانوں کی رہائشی بیرکیں۔ آفیسرز میس کے الگ تھلگ ہونے کا یہ نقشہ ذرا اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے، تب آپ ان دہشتوں کا تصوّر آسانی سے کر سکیں گے جن سے پہلی رات ہم دوچار ہُوئے۔

کھانا وانا کھلا کر میس کا سٹاف رُخصت ہُوا۔ چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو، اردلی ہمیں آخری سلام کہہ کر بیرکوں کی طرف چلتا بنا۔ تب ہم نے لالٹین کی مدھم روشنی میں میس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ صرف دو کمروں پر مشتمل تھا اور چونکہ عرصہ دراز سے خالی پڑا تھا اِس لیے فرنیچر یا آرائشی چیزوں کے تکلف سے بے نیاز تھا۔ لکڑی کے فرش پر پتلی سی دری، معمولی قسم کا ایک صوفہ، دو چار کرسیاں، ایک آدھ تپائی اور کونے میں ایک الماری — الماری کھولی تو اس میں گرد کی تہیں اور چند کتابیں نظر آئیں۔ الٹ پلٹ کر دیکھیں تو اِنتہائی گھسے پٹے امریکی ناول نکلے۔ انھی کتابوں میں دو رجسٹر نظر پڑے۔ ایک تو وِزیٹرز بک VISITORS BOOK تھی۔ دُوسری ہنٹنگ بک HUNTING BOOK وِزیٹرز بک میں کہانی ہوا کرتی ہے ان تأثرات کی جو آنے والوں کے دِلوں پر مرتسم ہُوتے، اِن نقوش کی جو اِرد گرد کے ماحول نے ان کے ذہن پر بٹھا دیے اور اس

عشق کی جو حسین نظاروں کو دیکھ کر قدرت کے لیے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ شکار بک ان تجربات پر مشتمل بھی جو شکار کے سلسلے میں پیش آئے۔

شکار بک ۱۹۵۵ء سے شروع ہوتی ہے۔ ۵ر جنوری ۱۹۵۵ء سے مئی، ۱۹۵۶ء تک ایک ہی شخص کی تحریر ہے۔ دستخط مبہم سے ہیں، البتہ آخر میں حسین کا لفظ صاف پڑھا جاتا ہے۔ بڑے دلچسپ مشاہدات ہیں۔ آپ بھی پڑھیں۔

۵ر جنوری ۱۹۵۵ء

آج یہاں سخت برفباری ہوئی۔ سردی سے ٹھٹھرے چکوروں کا ایک جوڑا، دفتر میں کلرکوں کی میز کے نیچے آ دبکا۔ کلرکوں نے ان کے بلا اجازت اس طرح اندر گھس آنے کو میرے احکام کی خلاف ورزی جانا اور دونوں کو "گرفتار" کر کے میرے حضور پیش کیا گیا۔ میں نے مشکیں کسوا کر انھیں ڈاکٹر شاہد اور ان کی اہلیہ کے لیے استور بھجوا دیا۔ کیونکہ وہ ایسے گستاخ اور بے باک گھس بیٹھیے INSURGENTS بہ نفسِ نفیس دیکھنا چاہتے تھے۔

۳۱ر جنوری ۱۹۵۵ء

جنوری کے دوران ٹوٹل شکار

چکور ——— ۱۶

مرغابیاں ——— ۷

راج ہنس ——— ۱۱

فروری ۱۹۵۵ء

۲ فروری کو استور جاتے ہوئے راستے میں شکار کی خاصی تلاش کی لیکن ناکام رہے، گوری کوٹ سے آگے میں خود گھوڑے پر سوار ہو گیا اور شاٹ گن اردلی کے سپرد

کر دی۔ اچانک ایک موڑ کاٹتے پر سامنے چکوروں کا ایک جوڑا نظر آیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اُڑا ہی چاہتے تھے کہ میں نے جھٹ شاٹ گن لی اور نشانہ لیے بغیر فائر کر دیا۔ فاصلہ بہت کم تھا اس لیے چھروں سے چکور ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ہم پھر محروم کے محروم ہی رہے۔

(مارچ سے اپریل تک برف کے بڑے بڑے تودے اور لانی گرنے کے موسم کی وجہ سے آمد و رفت بند رہتی ہے۔ غالباً اسی لیے ان مہینوں میں کسی سرگرمی کا ذکر نہیں)

جون ۱۹۵۵ء

مقامی لوگوں نے شکایت کی کہ ریچھوں کا ایک پورے کا پورا خاندان فقیر کوٹ میں دندناتا پھرتا ہے۔ وہ کئی مویشی ہڑپ کر چکے ہیں۔ ایک گڈریا بھی ان کے ہاتھوں سخت زخمی ہوا لیکن جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم نے ایک پارٹی ترتیب دی جس نے تین دنوں کی محنت کے بعد اس خاندان کا سراغ لگایا۔ مڈبھیڑ ہونے پر ایک ریچھ مر گیا۔ باقی بھاگ گئے۔ اس کے بعد پھر کوئی شکایت نہیں آئی۔

پڑھتے پڑھتے یہاں تک پہنچے تھے کہ دائیں طرف کے دروازے کے باہر کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ تمام فرش لکڑی کا تھا اس لیے کسی طرف بھی کوئی چلتا، چاپ صاف سنائی دیتی تھی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ چاند نکل آیا تھا اور اس کی چاندنی چاروں طرف چٹکی ہوئی تھی۔ پہاڑوں پر گہری خاموشی طاری تھی۔ درخت سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ . . . . . . اور . . . . . . کھٹاک . . . . چشم زدن میں ہم نے دروازہ بند کیا، بجلی کی سی تیزی سے چٹخنی چڑھائی اور دروازے سے پُشت لگائے بدحالی سے کھڑے ہو گئے۔ اُوپر کا سانس اُوپر، نیچے کا نیچے — دل . . . . دھڑ . . . دھڑ . . . . . دھڑ . . . . یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے، گلا خشک اور پاؤں من من بھر کے ہو گئے ——— برآمدے

ہیں دروازے کی طرف پُشت کیے ایک ریچھ کھڑا تھا۔

چاندنی کو دیکھ کر ہم اِتنے بے خُود ہو گئے تھے کہ دروازے کے بالکل قریب کھڑا شرُوع میں وہ نظر ہی نہ آیا ـــــ اور اب ـــــ کھڑے لرز رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے دروازے کو یاجوج ماجوج چاٹ رہے ہوں۔ کتنی ہی صدیاں اسی کیفیت میں بیت گئیں ـــــ بالآخر قدموں کی دُور ہوتی چاپ سنائی دی ـــــ ہم نے تھوک نگلا اور بستر کی طرف قدم بڑھایا لیکن یوں لگا جیسے پَیر زمین میں دھنس گئے ہوں ـــــ کچھ دیر اور وہیں کھڑے رہے۔ آیۃ الکرسی پڑھی۔ اَوسان بحال ہوتے اور "دفاعی" صُورتِ حال پر غور کیا تو پَیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اِس بوسیدہ سے مَیس میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو ہنگامی صُورتِ حال میں ہتھیار کا کام دے سکتی۔ کوئی آرائشی خنجر، قدیم تلوار، نیزہ ہی ہوتا۔ ڈھارس تو بندھتی۔ اِس حالت میں ریچھ اندر گھُس آتا تو خالی ہاتھوں ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ مدد کے لیے کسی کو پکارنا عبث تھا۔ آفیسرز میس سے قریب ترین عمارت دفتر تھے جن کا کم از کم فاصلہ دو فرلانگ تو ہوگا اور ڈیوٹی کلرک جاگ بھی رہا ہوتا تو دفتروں کے آخری سرے پر کمرے میں بند بیٹھا ہوگا ـــــ دروازے سے کان لگائے، چاپ بالکل بند ہو گئی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ بستر تک آئے تو شکار بک کھلی پڑی تھی۔ اور صفحے کی آخری سطریں ہمارا مُنہ چِڑا رہی تھیں۔

"ریچھوں کا ایک پُورے کا پُورا خاندان فقیر کوٹ میں دندناتا پھرتا ہے۔ وہ کئی مویشی ہڑپ کر چکے ہیں۔ ایک گڈریا بھی ان کے ہاتھوں سخت زخمی ہُوا لیکن جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہم نے ایک پارٹی ترتیب دی جس نے تین دِنوں کی محنت کے بعد اِس خاندان کا سراغ لگایا۔ مُڈبھیڑ ہونے پر ایک ریچھ مرگیا۔ باقی بھاگ گئے۔ اس کے بعد پھر کوئی شکایت نہیں آئی ـــــ

ایک ریچھ مرگیا، باقی بھاگ گئے، پھر کوئی شکایت نہیں آئی۔
ایک ریچھ مرگیا، باقی بھاگ گئے، پھر کوئی شکایت نہیں آئی۔
ذہن میں ریکارڈ کی سُوئی اٹک گئی۔ باقی صفحہ غائب ہوگیا۔ بس یہ سطر گُونجنے لگی۔

"ایک ریچھ مرگیا، باقی بھاگ گئے، پھر کوئی شکایت نہیں آئی۔"

کہاں سے شکایت نہیں آئی۔ گاؤں کی طرف سے نا ـــــ لیکن یہ ریچھوں کا نمائندہ جو آیا ہے، ہم سے شکایت کرنے۔ اس کا کیا کریں۔ تب ریچھوں کے بارے میں ساری سُنی سُنائی روایات یاد آنے لگیں۔ اس دن پتہ چلا شاعر نے بڑے سوز کے ساتھ

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

جیسی دُعا کیوں کی تھی ـــــ اب جانے یہ ریچھ تھا یا ریچھنی ـــــ لیکن ہمارے تلوؤں سے چنگاریاں نکلنے لگیں یوں لگا جیسے کوئی خاردار زبان ہمارے تلوے چاٹ رہی ہے، ـــــ اور ـــــ کلیجہ ایک بار پھر اُچھل کر حلق میں آگیا ـــــ دھمک دھم ـــــ دھمک دھم ـــــ ریچھ کے قدموں کی آواز پھر قریب آرہی تھی ـــــ غیر ارادی طور پر اٹھے اور دروازے کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے کہ اگر اس نے دروازے سے زور آزمائی کی تو کم از کم دروازہ بند رکھنے کی کوشش ہی کی جاتے۔ لیکن اس بار پہلی جیسی گھبراہٹ نہ تھی۔ ذہن سوچ رہا تھا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ کہیں کوئی سنتری نہ ہو۔ لیکن سنتری ہوتا تو آواز فوجی جُوتوں کی ہوتی اور لکڑی کے فرش پر ان کی ٹھک ٹھک یا کھٹا کھٹ صاف پہچانی جاتی۔ یہ تو دھمک دھم ـــــ دھمک دھم جیسی آواز تھی ـــــ ہاں ریچھ کے پاؤں کافی نرم ہوتے ہیں۔ اس نے ناخن اندر کیے ہُوئے ہوں تو ایسی آواز ہی آسکتی ہے پھر بھی ممکن ہے وہم ہُوا ہو، دروازہ کھول کر باہر جھانکنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے نظر کو دھوکا ہُوا ہو، کسی چیز کا سایہ بھی ہو سکتا ہے، چاندنی چِٹکی ہُوئی ہے نا ہر طرف۔ خدا کا نام لیا، تمام تر قوتیں مجتمع کیں، آہستگی سے چٹخنی اُتاری اور دروازے میں مُنہ دِیے، اسے ہلکا سا سرکایا ـــــ اور ـــــ کھٹ ـــــ کھٹاک۔ ہم نے فوراً دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی برآمدے میں سچ مچ کا ریچھ کھڑا تھا ـــــ

دروازے کا جائزہ لیا۔ خاصا مضبُوط تھا۔ چٹخنی پرانی طرز کی تھی لیکن بھاری لوہے کی بنی ہُوئی تھی۔ اس کے چٹخنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ دِل کو تسلّی ہُوئی۔ پھر کمرے کی دُوسری جانب کے دروازے کا جائزہ لیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد سے اب تک آمد و رفت اِسی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

دروازے سے رہی تھی۔ اسے بھی ٹھیک ٹھاک پایا۔ پھر آیۃ الکرسی پڑھی، ہاتھوں پر پھونکا اور تین دفعہ تالی بجائی۔ یہ عمل ہم نے کسی بزرگ سے سیکھا تھا۔ ان کے بقول جہاں جہاں تک تالی کی آواز جاتے، آیۃ الکرسی کا حصار قائم ہو جاتا ہے اور بلائیں اس حصار میں داخل نہیں ہو سکتیں۔

اِس عمل کے بعد ہم بستر پر آ گئے۔ رجسٹر اُٹھا کر ایک طرف پٹخا اور کسی ایسی چیز کی تلاش میں پھر نظریں دوڑائیں، جسے آلے کے طور پر اِستعمال کیا جا سکے لیکن سوائے قلم کے کوئی چیز نظر نہ پڑی۔ ڈھکن اتار کر نب کا جائزہ لیا۔ اس سے تو اس گدھے کے بچے کی آنکھیں بھی نہیں پھوڑی جا سکتی تھیں۔ ہوتی بھی بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ نشانہ خطا ہُوا تو . . . . ؟ سُنا ہے رِیچھ کی تو کھال بھی بڑی موٹی ہوتی ہے۔ پین کی نب چبھوئی تو ٹوٹ جائے گی۔ صلحنامے کا رقعہ لِکھ کر نہ بھیجا جائے! اسے دروازے کے نیچے سے باہر سرکا دیتے ہیں۔ لکھیں گے۔

بھالو بھائی!

آداب ——— ہم بِرگیڈ ہیڈکوارٹر میں جی تھری ایجوکیشن ہیں۔ بُنیادی طور پر تعلیمی امُور کے ذِمّہ دار۔ رِلو بھی اسی سلسلے میں آتے ہیں۔ تم نے اپنے بچّوں کو تعلیم دِلوانی ہو تو بے شک انھیں بھجوا دینا۔ لیکن تم خُود فوراً واپس چلے جاؤ تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

وَالسّلام

لیکن کوئی اَن پڑھ رِیچھ ہُوا تو . . . . . . ؟ ٹھنڈے پسینوں سے شرابور ہونے کے باوجود ہمیں اِن خیالات پر ہنسی آ گئی۔ ہنسی آنے سے ذہنی کھچاؤ کچھ کم ہُوا، اِضطراب دُور ہُوا۔ ہم نے پاؤں پسارے، چادر اُوپر لی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دُوسرے میں پھنسا کر ہاتھ سر کے نیچے رکھے اور چھت کو گھورتے ہُوئے غور و فِکر کرنے لگے ——— غور و فِکر کیا کرتے وہ رجسٹر جو ہم نے ابھی پٹخا تھا پھر ذہن میں گھُوم گیا۔

"فقیر کوٹ میں ریچھ دندناتے پھرتے ہیں۔

ایک رِیچھ مارا گیا، باقی بھاگ گئے، پھر کوئی شکایت نہیں آئی۔
ایک مارا گیا، باقی بھاگ گئے، پھر کوئی شکایت نہیں آئی۔
باقی بھاگ گئے، پھر کوئی شکایت نہیں آئی۔
پھر کوئی شکایت نہیں آئی۔
پھر کوئی ———
شکا ——— یت ——— "

جانے کب ہم نیند کی آغوش میں جا سوئے۔ آنکھ کھُلی تو سُورج کی روپہلی کرنیں روشندان سے کمرے میں در آئی تھیں۔ باہر کچن کی طرف سے مَیس سٹاف کے کام کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم اتنی گہری نیند سو کر اُٹھے تھے کہ رات کا واقعہ خواب سا لگا۔ غیر اِرادی طور پر اُٹھ کر دائیں والے دروازے کی طرف گئے۔ چٹخنی اُتاری، دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ ریچھ . . . کھڑا تھا . . . . . لیکن یہ کمبخت ساری رات ایک ہی پوزیشن میں کیسے کھڑا رہا۔ کیسا ریچھ ہے بھئی یہ . . . . ہیں . . . . یہ کھڑا کیسے ہے۔ دروازہ کھولا اور باہر آ گئے . . . . . . ہمت تھی کی . . . . . . یہ ریچھ کی کھال تھی جسے ایک اُدھیڑ سے لکڑی کے سٹینڈ پر ایسے سو کھنے ڈالا گیا تھا کہ اندر سے بالکل یوں لگتا تھا جیسے بذاتِ خُود رِیچھ کھڑا ہو۔ رہی سہی کسر اُس کی تھوتھنی نے پوری کر دی تھی جس میں ایک چھڑی پھنسا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

ریچھ تازہ تازہ مارا گیا تھا کیونکہ کھال کی چربی ابھی تک گیلی تھی بلکہ کہیں کہیں سے خُون بھی رِس رہا تھا . . . . . . لیکن وُہ قدموں کی چاپ؟

میس حوالدار کو آواز دی۔ پتہ چلا کہ ریچھ دو دن پہلے ہی شونتر پاس سے آتے ہُوئے ایک ٹیم پر حملہ آور ہُوا تھا اور ایک صُوبیدار کے ہاتھوں جہنم واصل ہُوا (بذریعہ گولی) کمانڈنگ آفیسر کی ہدایات پر اس کی کھال اُتار لی گئی تھی اور نمک لگا کر وہاں خشک کرنے کے لیے ڈالی گئی تھی . . . . . . رات کے سنتری کے بارے میں پتہ چلا کہ اس کے پاؤں میں تکلیف تھی چنانچہ اُس نے فوجی جُوتوں کی بجائے براؤن میٹل پی ٹی شوز جو پی ٹی شوز سے ذرا بڑے ہوتے ہیں پہن رکھے تھے اور تکلیف کی وجہ سے وہ چل بھی آہستہ آہستہ رہا تھا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہم پر گزشتہ رات جو کچھ گزری تھی، اسے خود تک ہی محدود رکھا. ناشتہ کیا اور معمول کے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔

سہ پہر واپس آئے، کھانا کھایا اور میس کے لان میں بیٹھ گئے۔ ٹھنڈے علاقوں میں گرمیوں کی تمازت بھی بڑی راحت افزا، سکون بخش ہوتی ہے اور یہ تو موسم سرما کا آغاز تھا۔ ایسے میں دھوپ کی کرنیں بڑی شفیق شفیق سی لگتی ہیں۔ خوش اخلاق، ملنسار، ——— گدگداتی، گنگناتی؛ ——— دھوپ میں بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ رات والا رجسٹر یاد آ گیا ——— سامنے برآمدے میں ریچھ تھوتھنی اٹھائے کھڑا تھا جیسے ہم پر ہنس رہا ہو۔ مسکرائے اور رجسٹر اٹھا لائے۔ فقیر کوٹ کے دندناتے ریچھوں پر ذکر ختم ہوا تھا۔ نئی بات کامری کے کسی بھورے ریچھ سے شروع ہوتی ہے۔ لیجیے تبصرہ ختم، آپ خود پڑھ لیں یہ رجسٹر۔

اکتوبر ۱۹۵۵ء

دو اکتوبر کو آرمی کے جوانوں کی ایک پارٹی صوبیدار قدیر شاہ کی زیرِ سرکردگی کامری پاس سے آ رہی تھی کہ انھوں نے ایک بھورا ریچھ راستے میں کھڑا پایا۔ صوبیدار نے اس پر گولی چلانے کی کوشش کی لیکن اس نے بڑی تندی سے اُلٹا صوبیدار پر حملہ کر دیا۔ سپاہی نثار خان نے یہ منظر دیکھا تو اپنی رائفل لوڈ کی اور ریچھ پر فائر کر دیا۔ ریچھ گرا تو اس نے پورا میگزین اس پر خالی کر دیا۔ صوبیدار کو گہری خراشیں آئی ہیں لیکن جان خطرے سے باہر ہے۔

۲۰ر نومبر ۱۹۵۵ء

میر ملک نالے میں مرغابیوں کی ایک ڈار اترتے دیکھی گئی۔ ہمارے پہنچنے پر وہ اڑ گئیں تاہم چار کو اسیر بنانے میں کامیاب ہوئے۔

۲۷ر جنوری ۱۹۵۶ء

گزشتہ چند دنوں سے گیدڑوں کا ایک غول کا غول ہر رات میری رہائش گاہ پر آتا ہے۔ پیٹر (کتے کا نام) کا دم غنیمت ہے کہ انھیں نکال باہر کرتا ہے۔ ایک لومڑی کافی دنوں سے ——— میری مرغیوں کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں نے شکاری کو بتا رکھا تھا. کل رات اسے جہنم واصل کر دیا گیا۔

یکم مئی ۱۹۵۷ء

صبح سویرے پتہ چلا کہ دریائے کالاپانی کے پار مارخوروں کا ایک ریوڑ دیکھا گیا ہے ایک پارٹی ترتیب دی گئی جو شام تک تین مارخور پکڑ لائی۔ کل عیدالفطر ہے اور مارخور کے گوشت کے ساتھ ظاہر ہے عید کا مزہ دگنا ہو جائے گا۔

۲۵ر مئی ۱۹۵۷ء

آج ایک کالا ریچھ اور ایک مشک نافہ کا شکار کیا گیا۔

اس کے بعد نہ صرف تحریر بدل گئی ہے بلکہ اندازِ تحریر بھی بدلا ہوا ہے۔ اِختصار کی جگہ تفصیل نے لے لی ہے۔ ایک ایک واقعہ کئی کئی صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ کہیں کہیں صیغہ واحد متکلم ہے ورنہ تاثرات کا رنگ رپورٹ کا سا ہے۔ جیسے کسی صاحب کو روزمرہ کے واقعات کے اندراج پر مامور کیا گیا ہو۔ مشتے از خروارے۔

۲۳ر جولائی ۱۹۵۷ء

شونٹر پاس پر پیراشوٹ سے چھلانگ لگائی۔ جنگلوں سے گزرتا، ٹھوکریں کھاتا، آج ہی یہاں پہنچا ہوں۔ یوں لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے جنت یہیں تخلیق فرمائی ہے۔

فلائٹ لیفٹیننٹ آئی اے ملک

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

دسمبر ۱۹۵۷ء

پشین نالے میں برفانی چیتوں کے ایک جوڑے نے پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ یہ چوبیس مویشیوں کو ڈکار چکے ہیں اور ایک چرواہے کو بھی شدید زخمی کیا۔ یہ چرواہا اپنے مویشی چرا رہا تھا جب چیتوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ جان بچانے کے لیے اُس نے ایک چٹان سے نیچے چھلانگ لگا دی ـــــ جان تو بچ گئی لیکن کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس کے گرنے کے بعد چیتے مویشیوں پر پل پڑے۔ اس واقعے کے بعد سے نالے میں آمد و رفت بند ہے۔

علاقے میں موجود فوجی افسر میجر ایم جی حسن کو اطلاع ہوئی تو وہ دو آدمیوں کے ساتھ ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو چیتوں کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ ۱۱ر دسمبر کو استور میں ٹھہرے۔ ۱۲ر دسمبر کو پشین نالے پہنچے۔ (اس کے بعد میجر صاحب کے سفر، چیتوں سے مڈبھیڑ اور مقابلے کی مفصل کہانی ہے۔ خوفِ طوالت قلم روک رہا ہے۔ مقابلہ ختم ہو چکا ہے۔ شکار کا حلیہ ملاحظہ فرمائیں۔) یہ چیتا نہیں چیتی تھی۔ ناک سے لے کر دُم تک کا فاصلہ سات فُٹ ساڑھے پانچ اِنچ تھا۔ مقامی لوگ اسے بانسوں پر اُٹھا کر لے گئے اور پورے گاؤں میں پھرایا۔ بعد ازاں اِس کی کھال مجھے پہنچا دی گئی۔

اس کے بعد مذکورہ بالا واقعات سے مشابہ حالات میں ادر مار خوروں، مشک نافہ ہرنوں اور مرغابیوں کے شکار کی تفصیلی داستانیں ـــــ ہاں یہ نئی بات ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اگست ۱۹۶۲ء

ایم۔ ٹو چوٹی کی تسخیر

اگر میس کے برآمدے میں کھڑے ہو کر آپ وادی شونتر کی طرف رُخ کریں تو پہاڑوں کے سِلسلہ ہائے میر ملک کے درمیان آپ کو ایک سفید اور پُرشکوہ چوٹی واضح طور پر نظر آئے گی۔

آپ اسے ایم۔ ٹو کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ نقشوں پر اس کا یہ نام آپ کو نظر نہیں آئے گا صرف بلندی لکھی ہوئی مِلے گی۔ سولہ ہزار ایک سو چالیس فُٹ۔ صحیح ہے۔ اس سے پہلے یہ باوقار چوٹی بے نام ہی تھی۔ ہم نے اسے ایم۔ ٹو کا نام دیا ہے۔ اِس لیے کہ آج ہی ہم (محمود اور حامد مختار) اسے فتح کرکے لوٹے ہیں۔

آئندہ سال ۱۹۶۳ یا اس کے بعد کے سالوں میں جب بھی موسم صاف مِلا تو شاید آپ بھی اسے سر کرنے کی کوشش کریں۔ نہایت مستحسن فیصلہ ہوگا۔ چوٹی کے اُوپر آپ کو ایک بورڈ ملے گا۔ لکڑی کی ایک چوب گاڑ کر اس بورڈ کو اس پر ٹھونک دیا گیا ہے۔ بورڈ پر ہمارے نام اور دستخط موجود ہیں۔ اگر آپ وہاں تک پہنچ جائیں تو اِس بورڈ پر اپنا نام بھی لکھ دیں اور ہمارے نام دُھندلا گئے ہوں تو انھیں پھر سے لکھ دیں۔

(محمود صاحب اور حامد مختار صاحب! جانے آپ آج کل کہاں ہیں۔ اگر یہ سطریں آپ کی نظروں سے گزریں تو ایم۔ ٹو چوٹی کا نام رکھنے اور اسے سر کرنے پر ہماری طرف سے مبارکباد۔ ہم ایم ـــــ ٹو پر جا کر بورڈ پر لکھے آپ کے نام تو دوبارہ نہیں لکھ سکے لیکن آپ کا کارنامہ عام کر رہے ہیں۔ مصنف)

۱۰ر فروری ۱۹۶۳ء

(یہ کسی اور صاحب بہادر کی تحریر ہے۔)

بابا! میں شکار وکار کا اِتنا شوقین نہیں البتہ چکور مِل جائیں تو بھون کر کھانے کی حد تک ساتھ دے سکتا ہوں۔ جنوری میں میرا شکاری سیف اللہ پانچ چکور پکڑ لایا۔ دو میں نے افطاری کے لیے رکھ لیے۔ تین ناردرن سکاؤٹس کے سنٹر بھجوا رہا تھا لیکن وہ راستے میں میجر اعظم عرف لہری نے اغوا کر لیے۔ فروری کے پہلے ہفتے میں کچھ مرغابیاں اسیر ہوئیں، انھیں میں نے خود ہی میجر اعظم کو بھجوا دیا کہ خواہ مخواہ بیچارہ لوٹ مار کے گناہ کا مرتکب نہ ہو۔ بدلے میں اس نے مجھے ایک رام چکور بھیجا جسے میں سحر و افطار میں تھوڑا تھوڑا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کرکے کماتا رہا۔ شاید سارا ثواب میجر اعظم ہی کو جا رہا ہے۔

۱۲ر اگست ۶۷ء

پوائنٹ ۱۶،۱۴۰۰ (ایم۔ ٹو کے نام سے جس کا ذِکر پہلے گُزر چکا ہے) رٹو کے جنوب میں تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم نے آج اسے سر کرنے کی کوشش کی لیکن جب چوٹی بالکل دو چار ہاتھ رہ گئی تو ہمتیں جواب دے گئیں۔ تھکن سے چور تھے اور انگ انگ دُکھ رہا تھا۔ کوشش کی کہ آخری معرکہ بھی سر کر ہی لیں لیکن اوپر ڈھلوان بہت ہی عمودی ہے۔ ایک قدم اوپر جانے کی سکت نہ تھی۔ لوٹ آئے۔

فلائٹ کیڈٹ طاہر احمد ــــ فلائٹ کیڈٹ نعیم ہمدانی

[جون ۱۹۷۰ء میں یہ تأثرات پڑھتے ہوئے کسی بزرگ نے اس تحریر کی ایک جانب لکھا ہے:

"حوصلہ، میرے بچو، حوصلہ ــــ جام لبوں تک آنے سے پہلے کئی سخت مقام آتے ہیں۔"]

۱۹ر جون ۱۹۶۸ء

میجر عباسی بخوشی ہمارے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے اور آج ہم نے بھی پوائنٹ ۱۶،۱۴۰۰ سر کیا۔ چوٹی پر پہنچے ہی تھے کہ بارش اور برفباری نے آلیا اِس لیے جلد ہی لوٹنا پڑا۔

کیپٹن لیئق احمد

(فیلڈ سپلائی ڈپو ــــ گلگت)

۱۵ر جولائی ۱۹۶۸ء

آج ایک لدی پھندی جیپ میں بیٹھ کر گلگت سے یہاں آنا پڑا ــــ اُف توبہ اتنے موڑ اور اِتنا پُرپیچ راستہ ــــ سر چکرا گیا۔ یہاں پہنچے تو سمتوں کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ میں

نے ایک اور افسر سے شمال کی سمت معلوم کی وہ بھی تھکے ہُوئے تھے، چپ رہے۔ میں نے پھر پُوچھا، وہ گول کر گئے۔ میں نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا تو جھنجھلا کر انھوں نے ایک ایسی سمت کی طرف اِشارہ کیا جو میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔

ویسے ــــ اگر آپ بُرا نہ منائیں تو پوچھوں ــــ شمال ہے کدھر؟

کیپٹن .... (دستخط پڑھے نہیں جاتے)

۷ر دسمبر ۱۹۷۲ء

اسسٹنٹ ڈائرکٹر میڈیکل سروسز کرنل صدیق چراغ پا ہیں۔

"اِس علاقے میں جو پرندے، جانور اور جنگلی درندے ملتے ہیں، دُنیا کے بہت کم خطوں میں پائے جاتے ہیں۔ رام چکور دُنیا بھر میں ڈُھونڈے سے نہیں ملتا۔ آئی بکس IBEX صرف چین کے صوبہ سنکیانگ میں پایا جاتا ہے۔ سندھ میں جو آئی بکس ملتا ہے وہ اصل میں صحرائی بکرا DESERT GOAT ہے۔ مرغِ زرّیں صرف نیپال اور کشمیر میں ہے۔ "دانہ گیر" WESTERN TRAJOPAN کی تو ہم نے نسل ہی مٹا کر رکھ دی۔ یہ بڑا ہی خُوبصورت پرندہ تھا۔ آج کل اگر برفانی چیتے SNOW LEOPARD دیہاتوں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کی قدرتی خوراک مارخور، آئی بکس، ہرن مشک نافہ اور اس طرح کے دُوسرے جانور ختم کر دیے ہیں۔ خدارا دنیا کو یہ کہنے کا موقع مت دیں کہ مسلمان جس چیز پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ اسے فنا کر کے چھوڑتے ہیں۔ خُدا کی اِس خُوبصورت مخلوق کو زندہ رہنے دیں۔ اگر ایڈونچر کا اتنا ہی شوق ہے تو فوٹوگرافی کیجیے۔ برفانی چیتوں کو ہلاک کرنے کی بجائے اسے کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کیجیے۔

۳ نومبر ۱۹۷۲ء

برائے مہربانی اچھے شکاریوں کی یوں حوصلہ شکنی نہ کیجیے۔ شکار کرنا ایک کھیل ہے اور کھیل کو کھیل ہی رہنے دینا چاہیے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کرنل مختار احمد ۔ ڈی آئی جی ۔ ایف سی این اے

۲۲ر نومبر ۱۹۷۳ء

میں کیا کروں ——— ؟ پیار یا شکار!!

۲۲ر مئی ۱۹۷۴ء

دو کرنیلوں کے درمیان یہ جھگڑا سلجھانا کسی وفاقی وزیر سے کم رتبے کی شخصیت کے لیے ممکن نہیں تھا۔ معلوم نہیں مرکزی حکومت کے کانوں تک کرنیلوں کے اس جھگڑے کی بات کیونکر پہنچی کیوں کہ دارالحکومت سے کوئی آدمی حال ہی میں تو رٹو نہیں آیا تاہم اس قضیے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ اور حکومت نے ہر قسم کے شکار پر دو سال کے لیے پابندی عائد کر دی ہے۔ اس فیصلے کا اطلاق مرغابیوں پر بھی ہوگا جو ہر سال ہجرت کرتی رہتی ہیں۔ اس فیصلے سے دونوں کرنیلوں کی تشفی ہو جانی چاہیے۔

صرف کرنل صدیق کے لیے:

سر! مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ شکار کا شوق صرف مسلمانوں تک محدود نہیں۔ بدھ مت اور جین مت کے پیروکاروں کو چھوڑ کر شکار کرنا دنیا کے ہر حصے میں ایک قابلِ اعزاز کھیل ہے۔ آئیے اس جھگڑے کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں۔

دستخط

لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال بیگ

کمانڈنٹ ناردرن سکاؤٹس

قارئینِ کرام!

اس کے بعد ظاہر ہے شکار قانوناً تو جرم ہی قرار پایا ہے لیکن شکار بک میں شکاریوں کی داستانیں جاری ہیں گرچہ ان کی تعداد میں واضح طور پر کمی دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کی حیثیت قانونی خلاف ورزیوں کی ہے اس لیے یہ سلسلہ یہیں چھوڑتے ہیں۔

آئیے آپ کو دوسرے رجسٹر سے رٹو کے قدرتی مناظر کے بارے میں مختلف تاثرات پڑھوائیں ——— تاثرات کے نیچے دستخطوں کی نوعیت جناتی ہے۔ اس لیے اصل ناموں کا پتہ نہ چل سکا ——— لیجیے تاثرات کی کہانی ....

"کرۂ ارضی پر حسین ترین سبزہ زار ..... رٹو"

"مدہوش کن قدرتی مناظر"

"قیام مختصر تھا ..... لیکن خوشگوار ترین ..... ناقابلِ فراموش۔"

"بوجھل دل سے رٹو کو الوداع کہہ رہا ہوں"

"دیوانے لوگوں کے ہجوم سے دور ..... پرسکون قیام اچھا لگا۔"

"برف سے مستور پہاڑوں کی چوٹیاں جنھیں اب تک انسانی قدموں نے نہیں چھوا۔ لامتناہی حسن کے خوشگوار مناظر ..... جس سکون کے چند لمحے مجھے دنیا نہ دے سکی، یہاں بے بہا ملا ——— اس کا حسن مجھے مسحور کر رہا ہے ..... میں چلا .... کس قدر خوبصورت ہے یہ جگہ ..... مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر کہ میری آنکھیں اس سارے حسن کو یکبارگی اپنے اندر کیوں نہیں سمو لیتیں ——— میرا دماغ حسن کی ان بے شمار یادوں کو محفوظ نہیں رکھ سکے گا ..... اُف میرے خدا یہاں کی ہر چیز مجھے تیری عظمت کا احساس دلاتی ہے ..... اس حسن سے میں مخمور ہوا جاتا ہوں ——— اوہ میرے خدا، تخلیق تجھی کو زیبا ہے ..... حمد تیرے ہی لائق ہے تو سب سے بڑا ہے۔"

وارننگ

"مہربانی کر کے خیال رکھیں، یہ رجسٹر امتحانی مضمونوں کی مشق کرنے کے لیے یہاں نہیں رکھا گیا۔ تاثرات کا اندراج مختصر ترین الفاظ میں کیجیے۔ شکریہ۔

دستخط

"میس سیکرٹری"

وارننگ کے فوراً بعد یو این او کے کسی افسر کے تاثرات ہیں ایک جملے پر مشتمل۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"BEAUTY! THY NAME IS RATTU"

ہمیں اپنی عاجزی کا اِعتراف ہے کہ اِس سادہ سے جُملے کا ہم سے ترجمہ نہیں ہو سکا۔ کوئی صاحب کر سکیں تو ہمیں بھی بتائیں۔ ترجمہ ایسا ہو کہ اصل جُملے کا حُسن و جمال زائل نہ ہونے پائے۔

مندرجہ بالا تاثرات میں مارخور اور مُرغِ زرّیں کا ذِکر آیا ہے۔ ان سے تفصیلی تعارُف کرایا جائے آپ کا۔

مارخور

یہ فارسی لفظ ہے جس کا مطلب ہے سانپ کھانے والا۔ جی ہاں! یہ معصوم صُورت حضرت سانپ نوش فرماتے ہیں بلکہ نوش تو بہت بعد میں فرماتے ہیں۔ سانپ مِل جانے پر کافی دیر تک اس سے اٹھکیلیاں کرتے ہیں، سُم مار مار کر اسے زخمی کرتے ہیں۔ پھر دم سادھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سانپ بھاگ نکلتا ہے تو پھر اسے جا لیتے ہیں۔ جب وُہ بالکل اَدھ موَا ہو جائے تب اسے شرفِ خُوردن بخشتے ہیں۔ طعام کے بعد قیلولے کی باری آتی ہے، تب آرام سے کسی چٹان پر بیٹھ کر موصُوف جگالی فرماتے ہیں۔ اس جگالی سے ان کے منہ سے ایک جھاگ نکلتی ہے جو سُوکھ کر سانپ کاٹے کا بہترین علاج، تریاق بن جاتی ہے۔ سپیروں کی زبان میں اسے منکہ کہتے ہیں۔ جہاں سانپ نے کاٹا ہو اسے رکھ دیا جائے تو سارا زہر چُوس لیتا ہے۔

عام حالات میں مارخور بڑا درویش صِفت جانور واقع ہُوا ہے۔ گھاس پھُوس چر کر گزارہ کر لیتا ہے۔ موسِم سرما میں جب زمین برف سے ڈھک جاتی ہے تو درختوں کی سوکھی ہُوئی چھالوں سے بھی پیٹ بھر لیتا ہے۔ پانی کے معاملے میں خاصا قناعت پسند واقع ہُوا ہے۔ خُشک موسم یا مِلاپ کے دِنوں میں پانی کے ذخیروں تک جانے کی زحمت گوارا کرتا ہے لیکن برف باری کے دنوں میں برف چاٹ کر ہی مُطمئن ہو جاتا ہے۔ قید کر لیا جائے تو بکریوں اور گائے بھینسوں کو دِیے جانے والے چارے پر پالا جا سکتا ہے۔ تاہم اسے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

نمک کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ آزاد ہو تو نمکین زمین چاٹتا پھرتا ہے۔ قید میں نمک کے ڈلے دِیے جاتے ہیں۔ نمک کی یہ ضرورت غالباً اسے اپنے سینگوں کی وجہ سے پڑتی ہے۔ جن کی اس کی زندگی میں خاصی اہمیت ہے۔ مر جائے تو یہ سینگ انسانوں کے کام آتے ہیں جو اسے لکڑی کے فریموں میں فِٹ کرا کے ڈرائنگ رُوم کی زینت بناتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ خطرے کے وقت مارخور سینکڑوں فٹ کی بلندیوں سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اپنے سینگوں کے بل زمین پر گِرتا ہے اور اسے کچھ نہیں ہوتا۔ لوٹ پوٹ کر کھڑا ہوتا ہے اور محفوظ پناہ گاہوں کی طرف بھاگ نکلتا ہے۔ دُشمن کھڑا منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ ویسے ہاتھ آ جائے تو گوشت بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ تیتر کے بعد سب سے زیادہ مزیدار گوشت انہی حضرت کا ہوتا ہے۔

مارخور کی عمر کا اندازہ اس کے پیچ دار سینگوں سے کیا جاتا ہے۔ عُمر کے ساتھ ساتھ اس کے سینگوں کے خم بڑھتے جاتے ہیں۔ ایک چھلا یا دائرہ ایک سال میں مکمل ہوتا ہے۔ اب تک مارے جانے والے مارخوروں میں سینگ کی لمبائی کا ریکارڈ ترپن اِنچ ہے۔ شکار کے قوانین کے مطابق پینتالیس انچ لمبے سینگ والے مارخور کا شکار کرنے کی اِجازت ہے۔ مادہ مارخور کا شکار سختی سے منع ہے جو مارخوروں کے گلّے میں صاف پہچانی جاتی ہے۔ اس کے سینگ چھوٹے، سیدھے اور پُشت کی طرف ہلکا سا خم لیے ہوتے ہیں۔

باقی جانوروں کی طرح اُن کے ہاں بھی ملنے مِلانے کے آداب و اوقات مقرر ہیں۔ ڈیٹنگ DATING اور فلرٹنگ FLIRTING موسِم سرما کے آغاز ہی سے شروع ہو جاتی ہے تاہم باقاعدہ مِلاپ سال کے سرد ترین دِنوں اکیس دسمبر سے جنوری کے آخر تک ہوتا ہے۔ سال کے باقی دِنوں میں مادہ اور نر مارخور الگ الگ رہتے ہیں۔ گویا موسِم وصال کا اِختتام موسِم فراق کا آغاز ہوتا ہے۔ تنہائیوں کے غم میں نر مارخور کمزور ہو جاتا ہے، الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا ہے اور آہستہ آہستہ بلند علاقوں کی طرف چلا جاتا ہے، تاہم مادہ مارخور وضعِ حمل تک مخصوص رہائشی علاقوں میں رہتی ہے۔ بچّوں کی پیدائش کا موسم جون کے آخری ہفتے سے جولائی کے آخر تک ہوتا ہے۔ عام طور پر جڑواں بچے پیدا

ہوتے ہیں اور پیدائش کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر پکڑے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں زندہ پکڑنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ آئندہ موسمِ وصال تک بچے اپنی ماؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔

شکار کرنے کے لیے بہترین موسم دسمبر سے اپریل تک ہے کیوں کہ اِن دِنوں یہ پانی کے ذخیروں اور آسان چراگاہوں کے قریب رہتے ہیں۔
کہتے ہیں جس جگہ اس کی کھال یا سینگ موجود ہو، وہاں سانپ نہیں آتے کہ ان سے خاص قسم کی ایک بُو نکلتی ہے جس سے سانپوں کو اپنے دُشمن مارخور کی موجودگی کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ بھاگ جاتے ہیں۔

مُرغِ زرّیں

آفتابی کِرنوں کی چمک، سونے چاندی کی دمک اور دھنک کے ساتوں رنگوں سے مزیّن مرغِ زرّیں شمالی علاقوں کا خُوبصورت ترین پرندہ ہے۔ پیٹ اور سینے کے پر سیاہ چمکدار دُم کے پر زرد نارنجی اور پُشت کے پر سفید ہوتے ہیں۔ جسم کے باقی حِصّوں کے پر سبز اور اُودے اُودے ہوتے ہیں۔ چونچ کے قریب جلد کا رنگ نیلا ہوتا ہے اور سر پر سبز پروں کی ایک خُوبصُورت کلغی ہوتی ہے لیکن وہ جو کہتے ہیں نا ؎

اچھّی صُورت بھی کیا بُری شے ہے
جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی

اِس بے چارے کا حُسن ہی اس کی تباہی کا پیامبر ہے۔ لوگ دیوانہ وار اسے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کلغی کو ٹوپیوں میں سجاتے ہیں اور کھال میں بھُس بھر کر سجاوٹ کے لیے اِستعمال کرتے ہیں۔ گلگت بلتستان کے علاوہ سوات، آزاد کشمیر اور صوبۂ سرحد کے کوہِ سفید کی پہاڑیوں اور ضلع ہزارہ کے مختلف علاقوں میں دس ہزار فٹ کی انتہائی بلندیوں پر واقع جنگلات میں مِلتا ہے۔

زو

زو شمالی علاقوں کا کثیر الاستعمال جانور ہے۔ بار برداری کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور سفر میں سواری کے لیے بھی۔ اس سے دُودھ بھی ملتا ہے، گوشت بھی اور رہنمائی بھی۔ جی ہاں رہنمائی بھی اور وہ اِس طرح کہ موسمِ سرما میں جب چار دں طرف برف کا ڈیرہ ہو تو اِنتہائی بلندیوں پر سفر کرتے ہُوئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ برف کے نیچے ٹھوس زمین ہے یا کوئی گہری کھڈ پہاڑی علاقوں میں جہاں چٹانیں نرم ہوں، پانی کے عمل کٹاؤ EROSION کی وجہ سے دریاؤں اور نالوں کی تہیں مسلسل گہری ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی جگہیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں کہ اُوپر کے کناروں کے درمیان فاصلہ اِنتہائی مختصر ہوتا ہے اتنا کہ ایک آدمی عام رفتار سے چلتا چلتا اسے پھلانگ لے لیکن دُور نیچے گہرائیوں میں پانی خوفناک غراہٹوں کے ساتھ بہہ رہا ہوتا ہے۔ کوئی اس میں گِر جائے تو بچ نکلنا تو دُور کی بات تدفین کے لیے نعش بھی نہیں ملتی ۔ دریا یا نالہ راستہ بدل لے تو یہ کھڈ اپنی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ دراڑ کی صُورت موجود رہتی ہے۔ جب برف گِرتی ہے تو اوپر کے دونوں کنارے نرم نرم برف میں چھپ جاتے ہیں لیکن کوئی بدقسمت راہ گیر اس پر قدم رکھ بیٹھے تو .... خوفناک اندھیری گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ بس ایسے میں یہ سیدھا سادہ بیل نما جانور کام آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے ایک خاص حِس سے نوازا ہے جس سے کام لے کر یہ برف میں بغیر کسی خطرے کے میلوں سفر کر سکتا ہے۔ جہاں کسی کھڈ، چٹانی دراڑ یا دلدل وغیرہ کا اندیشہ ہو وہیں رُک جاتا ہے۔ اور سموں سے ٹٹول ٹٹول کر دائیں بائیں سے کوئی اور محفوظ راستہ اِختیار کر لیتا ہے۔ مقامی لوگ جب موسمِ سرما میں دُور کے کسی سفر پر نکلتے ہیں تو زو کو آگے آگے چلاتے ہیں خود اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ وہ بے چارہ ان کا بوجھ بھی اٹھاتا ہے، رہبری بھی کرتا ہے ـــــ ہوا نا سچا رہنما ـــــ لیکن انسان انسان ہے۔ گرمیوں کا موسم آتا ہے تو اسے ہل میں جوت لیتا ہے۔

سخت برفباری کے دِنوں میں بھی باہر رہنا پسند کرتا ہے ۔ برف پر بیٹھ جانے کے بجائے اس کے کہ اس کا جسم سُن ہو، جہاں جہاں اس کا جسم لگے برف پگھلتی چلی جاتی ہے ـــــ گھانس پھونس کھاتا ہے، خوش رہتا ہے ۔ مقامی لوگ سردیوں کے لیے اپنی خوراک جمع کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے چارے کا بھی ذخیرہ کرتے ہیں ۔

اِمتحان در اُمورِ خانہ داری

امورِ خانہ داری پر خواتین کی اجارہ داری مسلّم لیکن زندگی میں کچھ مقامات ایسے بھی آتے ہیں جب مردوں کو بہ نفسِ نفیس یہ فرائض سنبھالنے پڑتے ہیں ۔ نوعیت اُن کی بدلتی رہتی ہے ۔

اعلیٰ درجے کے کسی ہوٹل میں جاتے ہیں تو مدھم مدھم روشنیوں اور ہلکورے لیتی ہُوئی موسیقی کی بکھرتی دھنوں کے درمیان، خاص وردی میں ملبوس، سیاہ بو لگائے آپ کی آمد کے ساتھ ہی ایک شخص آہستگی سے آپکے پہلو میں نمودار ہوتا ہے اور چہرے پر مصنوعی مسکراہٹیں لیے مینو آپ کے حضور پیش کر دیتا ہے ۔ جھلتے دِنوں کی کوئی دوپہر یا شام ہو تو اس کے ایک اشارے پر آپ کے سامنے خنک پانی کے صاف شفاف گلاس بھی آن موجود ہوتے ہیں ۔ جب تک آپ مینو پر غور فرماتے ہیں یا ایک سے زائد ہونے کی صُورت میں ایک دُوسرے سے "تبادلہِ خواہشات" کرتے ہیں ۔ یہ شخص مؤدب سرنگوں کھڑا ضابطے کی مسکراہٹ بکھیرتا رہتا ہے ۔

عام ہوٹلوں میں یہ کردار ذرا عوامی طرز میں دکھائی دیتا ہے ۔ آپ کی نشست سنبھالنے کے ساتھ ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ آپ کے سر پر آن سوار ہوتا ہے ۔ پانی کے گلاس میز پر پٹخ کر خُود سوالیہ نشان بن کر آپ پر جُھکتا چلا جاتا ہے ۔ اب اگر آپ نے چائے وغیرہ کا کہہ دیا تو خیر، وہ منہ بسورتا چلا جائے گا ۔ لیکن اگر آپ پُوچھ بیٹھے کہ "کیا پکا ہے"؟ تو زیادہ ٹِپ کی اُمید بشاشت بن کر اس کے چہرے پر بکھر جاتی ہے ۔ اور وہ نہایت فصاحت و بلاغت سے کوئی ڈھائی درجن ڈِشوں کے نام ایک ہی سانس میں گنوا دیتا ہے ۔

"سری پائے، آلو گوشت، توری گوشت، ٹِنڈا گوشت، گھیا گوشت، بھنڈی گوشت، کدو گوشت،

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

سادہ گوش، بُھنا گوشت، قورمہ گوش، دال گوش، پلاؤ، زردہ، بریانی،
مُرغ، کلڑ چھولے، چکڑ چھولے، سادہ چھولے۔"

سِول ملازمت میں رہتے ہوئے آپ چھڑے رہے ہیں۔۔۔ تو عابد صدیقی کی طرح در بدر ٹھوکریں بھی کھائی ہوں گی آپ نے! اور شہروں سے دُور تعیناتی کی صورت میں کچی پکی دال یا جلا بُھنا گوشت پکانے کی کوشش بھی کی ہو گی؟ اگر آپ نے کالج کا مُنہ دیکھا ہے اور ہوسٹلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے تو میس کمیٹی کے ممبر بننے کی جدوجہد تو کی ہو گی۔ آپ نے، ورنہ "حاضری" کم کروانے کے دعدوں پر ووٹ تو دیا ہی ہو گا کسی نہ کسی کو؟

ان صُورتوں سے سابقہ تب ہی پڑتا ہے جب گھر کی اکائی بکھرتی ہے، انسان پرانے رِشتوں سے ٹوٹتا ہے، نئی منزلوں، نئے ساتھیوں کی تلاش میں نئے نئے افق تلاش کرتا ہے لیکن خُون پانی سے زیادہ گاڑھا ہوتا ہے۔

نئے دوستوں کی دھن میں، تِری دوستی کو چھوڑا
کوئی تجھ سا بھی نہ پایا ترے شہر سے نکل کے

فوج میں افسروں کی رہائش اور کھانے پینے کے اہتمام کے لیے آفیسرز میس ہوتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک تو ہوتا ہے صدر جو پی ایم سی یعنی پریذیڈنٹ میس کمیٹی" کہلاتا ہے اور ایک ہوتا ہے میس سیکرٹری۔

ہماری شامتِ اعمال۔ کمانڈر نے جب دیکھا کہ دفتری اوقات کے بعد ہم فارغ سے فارغ ہیں اور ہمارے ہاتھوں گھوڑوں کی کمبختی آئی ہوئی ہے تو ایک حکمنامے کے ذریعے ہمیں برگیڈ میس کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔

ہیڈ کوارٹر میں ہماری ایجوکیشن برانچ کا کام بس واجبی سا تھا۔ برگیڈ کمانڈر کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ برفباری شروع ہونے سے پہلے اگلی چوکیوں تک کھانے پینے کی اشیا اور

تن ڈھانپنے کا وافر ساز و سامان پہنچ جائے۔ ایجوکیشن کا کام مؤخر کر دیا گیا تھا۔ ویسے بھی سال کا اخیر تھا۔ ہمارا اصل کام جنوری سے شروع ہونا تھا۔ مختصر پلاننگ یہ تھی کہ جب سپاہی دوسرے کاموں سے فارغ ہو، سردی سے چھپ کر کمروں میں گرم گرم انگیٹھیوں کے پاس آ دبکیں، تو ہم ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھما دیں ؎

بیکار مباش کچھ کام کیا کر

لیکن رواج رواج ہوتا ہے۔ اسی مختصر سی بات کو ہم نے خُوشنما انگریزی کا لبادہ پہنایا، اسے محاوروں اور چھوٹے بڑے فقروں پر پھیلایا، خُوبصُورت عنوان جمائے اور اس سب کچھ کا نام رکھا، "تعلیمی ہدایات برائے سال۔۔۔۔۔۔"

کمانڈر سے منظوری کے بعد جنوری تک ہم فارغ ہی تھے اور اس فراغت کے ناطے مَیس سیکرٹری قرار پائے۔

شروع شروع میں تو یہی سمجھے کہ مَیس سیکرٹری کا کام بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ ہر کھانے سے پہلے وہ کچن جائے، خانساموں پر رُعب جمائے، ویٹروں کو جھاڑ پلائے اور تمام ڈشوں کو ڈائننگ ٹیبل پر جانے سے پہلے ٹسٹ کرے، چیک کرے، بار بار، ذرا تفصیل کے ساتھ کہ سینیئر افسروں کی موجودگی میں ڈونگے خالی ہو کر اس کے پاس آئیں تو کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ لیکن جب مہینے کے آخر پر پی ایم سی نے میس بل تیار کرنے کی ہدایت کی اور تمام رجسٹر مکمل کرنے پر توجہ دینے کو کہا تو بعد از حیرتِ بسیار ہم پر یہ اِنکشاف ہوا کہ میس کو چلانے کے لیے ایک نہیں کئی کئی رجسٹر ہیں جن میں نہ صرف ایک ایک پائی کی آمد و خرچ کا حساب رکھا جاتا ہے بلکہ نمک مرچ کی آمد و رفت کا بھی اندراج کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہماری حالت اس گھریلو خاتون کی سی ہو گئی جس کی صبح سویرے ناشتے کے بعد پہلی فکر یہ ہوتی ہے کہ آج کیا پکایا جائے۔ گھریلو خاتون کو تو صرف ایک میاں کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جس کی خوشنودی کی خاطر اسے روزے کی حالت میں بھی ہانڈی کا نمک چکھنے کی اجازت ہے لیکن ہماری حالت مختلف تھی۔ برگیڈ میں ہم سب سے جُونیئر تھے اور وہ جو فارسی کا محاورہ ہے۔ "سگ باش، برادرِ خرد مباش" (چھوٹا بھائی ہونے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

سے کتا ہونا بہتر ہے ۔) اس کے اسرار ہم پر پہلی بار کھلے ۔ کمانڈر کو مرچوں سے خدا واسطے کا بیر تھا ۔ چنانچہ مرچیں کم رکھوائی جاتیں ۔ بریگیڈ میجر چٹپٹے کھانوں کے عادی تھے ۔ وہ کھانے کی میز پر مسلسل انھیں نکالتے ۔ ڈی کیو کو برتن صاف نہ رہنے کی مستقل شکایت تھی اور سگنل آفیسر روٹی کا کوئی نہ کوئی کچا ٹکڑا توڑ کر کمانڈر سے آنکھ بچا کر ہماری طرف بڑھا دیا کرتے کہ لو یہ رہی تمھاری کارکردگی ۔

وہ تو یہ شکر ہوا کہ کھانے پینے کی اشیاء وہاں ملتی نہ تھیں ۔ راستے تھے ناہموار ۔ اور وسائلِ سفر ناپید ۔ لے دے کے ایک جیپ کا سہارا ہوا کرتا ۔ پہلی برف گرنے کے ساتھ ہی اس کا سفر بھی ممنوع قرار پاتا کہ برف پر سفر خطروں سے خالی نہیں ۔ میس میں کھانا کھانے والے افسروں کی تعداد بس پانچ سات تھی ۔ ہمارے پاس پیسے تو کافی ہوا کرتے لیکن خریداری کے لیے بازار کہاں سے لاتے ۔ گرمیوں میں جب راستے کھلے ہوتے تو عام جوانوں کے ساتھ ہی افسروں کی تعداد کے حساب سے ہمیں بھی سبزیوں کے بند ڈبوں کی وافر مقدار مہیا کر دی جاتی جن میں آلو اور مٹر بند ہوتے ۔ ہمارا انتخاب بس یہیں تک محدود تھا کہ کس دن ہم آلو مٹر پکائیں اور کس دن مٹر اور آلو ۔

اتفاق سے ہمارے میس حوالدار کو کسی کام سے پنڈی بھیجا جانا تھا ۔ ہم نے اسے ہدایت کی کہ وقت ملنے پر وہ میس کے لیے کچھ ایسی چیزیں خریدتا لائے جو فلائٹ نہ ملنے پر خراب نہ ہوں ـــ وہ لوٹا تو معلوم ہوا خراب نہ ہونے والی اشیاء کے ناموں میں اسے صرف بیسن ہی یاد آسکا ۔ ایک فوجی طیارے میں جگہ مل جانے پر وہ ڈھائی من بیسن خرید لایا تھا ۔

رمضان کی آمد آمد تھی مٹر اور آلو اور آلو مٹر کھا کھا کر افسروں کی جان پر بنی ہوتی تھی ۔ عام دنوں میں آلوؤں کے چپس بنا بنا کر چائے کے ساتھ پیش کر دیے جاتے تو کس حد تک تنوع کا احساس ہوتا لیکن رمضان میں تو دن میں کھانا پینا بھی موقوف ہوتا تھا ۔ سو پی ایم سی نے میس کے ارکان کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا کہ رمضان کے لیے مینو تیار کیا جا سکے ۔ ہم کافی پریشان ہوتے کہ میس میں آلو مٹر کے ڈبوں کے بعد صرف بیسن موجود ہے ـــــــــ اور صرف بیسن کے ہوتے ہوئے کیا مینو تیار ہو سکے گا ۔

اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی ۔ ارکان کو کہ جن کی تعداد اس دن اتفاق سے نو تک جا پہنچی تھی ، تفصیل سے اجلاس کی اہمیت بتائی گئی اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی تجاویز اجلاس میں شرحِ صدر سے پیش کریں ۔ ہم نے بہ اجازتِ صدر یہ بات بھی گوش گزار کر دی کہ میس میں آلو اور مٹر کے ڈبوں کے بعد صرف بیسن موجود ہے ۔ تجاویز " میسر شدہ وسائل " کی حدود میں ہوں ۔

" بیسن سے کیا کچھ بنایا جا سکتا ہے " ؟ وضاحت چاہی گئی ۔

" پکوڑے ۔ "

" پکوڑے تو افطاری ہی میں زیادہ لطف دیں گے اس لیے انھیں افطاری ہی میں رکھا جائے ۔ "

" بجا ۔ "

" پہلے سات دنوں کا صرف افطاری کا مینو تیار کر لیا جائے ۔ "

" جیسا آپ چاہیں ۔ "

" تو میس سیکرٹری آپ ہمیں افطاری میں کیا کچھ دے سکتے ہیں ؟ "

" جی پکوڑے ۔ "

" چلیں ایک دن تو پکوڑے ٹھیک ہیں ۔ باقی دن ـــــــ ؟ "

" یہی سوچنے کے لیے اجلاس بلایا گیا ہے ۔ آپ تجاویز دیں ۔ "

" میس میں کیا کچھ موجود ہے ؟ "

" آلو اور مٹر ۔ "

" انھیں ماریں گولی ۔ " ایک صاحب بھنّائے ۔

" ٹھیک ہے سر ۔ "

" اور کیا ہے ؟ "

" بیسن ۔ "

" بیسن سے کیا کچھ بنایا جا سکتا ہے ؟ "

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"جی میرے علم کی حد تک تو پکوڑے بنائے جا سکتے ہیں۔"

"چلیں ایک دن تو طے ہُوا۔ لکھیں اتوار کو پکوڑے"۔ ایک اور صاحب نے اختلاف کیا "پکوڑے جمعرات کو کھائے جائیں اور معمولی بحث کے بعد یہ اختیار میس سیکرٹری کو سونپ دیا گیا کہ جس دن وہ چاہیں پکوڑے بنا لیا کریں۔ چنانچہ ہم نے لکھا:

مینو برائے افطار

پکوڑے برائے سوموار

"اچھا یہاں بازار میں کیا کچھ ملتا ہے؟"

"اوّل تو عصر کے بعد سے لوگ دکانیں بند کر کے اپنے اپنے گھروں کو سدھارتے ہیں۔ دُوسرے ان کے ہاں کھانے پینے کی اشیاء نہیں بکتیں۔ صرف ایک چھوٹی سی دکان کھلی رہتی ہے۔ دیر سے آنے والے ڈرائیوروں کے لیے۔"

"کیا کچھ ہوتا ہے اس کے پاس افطار کے لیے؟"

"جی پکوڑے۔"

"وہ تو خیر ہم میس میں بھی بنا لیں گے۔"

"جی جی! بالکل۔"

"کس دن رکھے گئے ہیں پکوڑے؟"

"جی سوموار کو۔"

"ویری ویل! میس میں اور کچھ نہیں ہے، مٹر اور آلوؤں کے علاوہ۔"

"جی بیسن ہے نا۔"

"بیسن سے کیا کیا چیزیں بنتی ہیں؟"

"جی میں نے عرض کیا تھا ـــــ پکوڑے۔"

خاموشی کا ایک وقفہ۔

ویٹر کو آواز دی گئی۔ خانساماں کو طلب کیا گیا۔

یہ خانساماں مقامی باشندوں میں سے عارضی طور پر بھرتی کیا گیا تھا۔ اصل خانساماں

چھٹی پر تھا۔ وہ ہوتا تو شاید بیسن سے بہت کچھ بنا سکتا۔ لیکن اس عارضی خانساماں اور پی ایم سی کے درمیان مذاکرات بُری طرح ناکام ہو گئے۔ سُنیے ذرا:

پی ایم سی اور خانساماں کے درمیان مذاکرات، میس ممبران گوش بر آواز،

"تم افطار کے لیے کیا کیا کچھ بنا سکتے ہو؟"

"سب کچھ بنا سکتا ہوں سرجی۔"

"مثلاً؟"

"سرجی، ہر چیز بنا سکتا ہوں لیکن یہاں کوئی چیز ملتی ہی نہیں۔ میس حوالدار پنڈی سے صرف ڈھائی من بیسن لایا ہے۔"

"بیسن سے تم کیا کیا چیزیں بنا سکتے ہو؟"

"سرجی پکوڑے۔"

"شٹ اپ۔"

اور پی ایم سی غصّے میں میٹنگ ادھوری چھوڑ کر چلے گئے۔

ایک اور سینیئر افسر نے صدارت سنبھالی، یہ افسر اتنے زیادہ سینیئر نہیں تھے کہ سب لوگ بندوق بنے بیٹھے رہتے۔ خانساماں سے پُوچھا گیا کہ وہ کم از کم پکوڑوں میں کوئی تو ورائٹی پیدا کرے، تب وہ بولا:

"سرجی، پکوڑے بن سکتے ہیں مختلف قسموں کے، سادے پکوڑے، آلو پکوڑے، بینگن پکوڑے، پالک پکوڑے۔"

"بھنگ پکوڑے"۔ کسی نے لقمہ دیا۔

اجلاس میں مسکراہٹیں بکھر گئیں۔

ہمیں ہدایت کی گئی۔

"میس سیکرٹری! نوٹ کرو پکوڑوں کی یہ مختلف قسمیں۔"

"کر لیں سر! لیکن یہ بینگن اور یہ پالک وغیرہ۔ اور"

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"بھنگ" کسی نے پھر لفظ سرکا دیا۔

قہقہہ اُڑا اور ہم نے سوال لوُزا کر دیا۔

"کہاں سے آتیں گی سر یہ چیزیں ؟"

"ہوں —— تو ہمارے پاس کیا متبادل رہ جاتا ہے ؟"

"سر! سادہ پکوڑے یا آلو پکوڑے۔"

اجلاس برخواست کر دیا گیا۔

دُوسرے دن جب دس بجے چائے کے وقفے پر ہم نے چائے کے ساتھ پکوڑے پیش کیے تو دیکھا پی ایم سی کی بھنویں تن گئی ہیں۔ وقفے کے بعد انھوں نے ہمیں اپنے آفس میں بلوایا اور انگریزی میں کچھ ہدایات دیں۔ جن کا مختصر ترجمہ یہ تھا "آئندہ میں یہ واہیات پکوڑے چائے کے ساتھ نہ دیکھوں۔"

اِس طرح ہم مٹر آلو، آلو مٹر کے بعد اِس تیسری ورائٹی سے محرُوم ہو گئے۔

لیکن میجر عزیز نے اس مشکل کا ایک حل نکالا۔ نہایت لذیذ اور خوش ذائقہ حل۔ انھوں نے راولپنڈی سے فِشنگ راڈ FISHING ROD منگوائی اور ایک شکاری تلاش کر کے اسے بھرتی کر چھوڑا۔ نام تھا اس کا کریم۔ دُوسری ذمّہ داریوں کے علاوہ وہ دریا کے استور سے مچھلیاں پکڑا کرتا —— ٹراؤٹ —— بہت ہی خوبصُورت مچھلی ہے، دھنک کے ساتوں رنگ اِنتہائی تناسب کے ساتھ اس پر موجود ہوتے ہیں —— حسین اتنی کہ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ، لذیذ اتنی کہ کھاؤ تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ۔ اس کی بائیوگرافی BIOGRAPHY بھی حیرتوں کے سمندر میں ڈھلی ہوتی ہے۔ یہ ان مچھلیوں کے گروپ سے تعلق رکھتی ہے جو انڈے کہیں دیتی ہیں، بچے کہیں جا کر نکلتے ہیں۔ بچوں کے ظہور کے وقت انڈے اپنی جائے پیدائش کو چھوڑ کر ہزاروں میل دُور آ چکے ہوتے ہیں لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تخلیق کے فوراً بعد وہ اپنے آبائی تالاب، جھیل، بحیرہ یا دریا کی طرف سفر شروع کر دیتے ہیں اور سینکڑوں ہزاروں میل کی صعوبتیں طے کر کے ٹھیک اسی جگہ پہنچتے ہیں۔ جہاں سے انڈوں کی شکل میں ان کا سفر شروع ہوا تھا۔ اس وقت تک انھیں کوئی کریم نہ پکڑے تو جوان ہو چکے ہوتے ہیں چنانچہ انڈے

دیتے ہیں اور باقی ماندہ ایام اپنے آبائی پانیوں کی گود میں گزار دیتے ہیں۔ انڈے پھر نشیب کی طرف بہہ نکلتے ہیں۔ نامعلوم منزلوں کی طرف۔ پاک ہے وہ ذات جس نے انھیں پیدا کیا، پھر راہ سجھائی۔

لیکن یہ مچھلی ...... ! جانے اس کا شمار گناہگاروں میں ہوگا یا نیکوکاروں میں کہ ایک بار اس نے بیٹھے بٹھائے ہمیں تگنی کا ناچ نچوا دیا۔ ہُوا یوں کہ برگیڈ کمانڈر مچھلیاں بھوننے کی نئی نئی ترکیبیں بتایا کرتے لیکن ذائقہ ان کے حسبِ منشا نہ ہو سکا۔ ایک دن تنگ آ کر انھوں نے کہا کہ آئندہ چھٹی کے روز وہ خُود مچھلیاں بھونیں گے —— کمانڈر کے لیے تو شاید یہ معمولی سی بات ہوتی لیکن ہمارے لیے قیامت آ گئی۔ کچن کو فرش سے عرش تک بدل کر ایک برگیڈیر کے شایانِ شان بنانا آسان کام تھا؟

کچن میں جا کر جھانکا تو اسے سخت غلیظ پایا۔ فرش پر کیچٹ کی تہیں، چھت پر جالے دیواریں دھوئیں سے کالی سیاہ، ٹوٹا پھوٹا چولہا، ایک طرف لکڑیوں کا انبار، دُوسری طرف بجھے ہوئے کوئلوں کا ڈھیر، میلی کچیلی صافیاں اُلٹے بدھے دیپنے، اِس حالت میں کمانڈر اِدھر آ نکلتے تو مچھلی بھوننے کی باری تو بعد میں آتی۔ انھوں نے ہمیں بھُون چھوڑنا تھا۔ امورِ خانہ داری کا کڑا اِمتحان تھا۔

چھٹی کے دن میں صرف دو روز باقی تھے۔ بس چلتا تو باورچیوں کو سوڈا کاسٹک میں ڈال کر اُبال چھوڑتے کہ کئی بار نہلوانے دُھلوانے کے باوجود وہ ہمیں میلے میلے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے لیے نئے ایپرن سلوائے گئے، پردے اور صافیاں دُھلوائی گئیں، دیواروں پر سفیدی کے کئی کوٹ پھروائے گئے، چُولہے نئے سرے سے تعمیر کروائے گئے —— دیگچیوں کی لپائی، فرش کی دُھلائی، باورچیوں کی ہیرکٹ کروائی گئی، ان کے دانت بار بار منجوائے گئے، ناخن ترشوائے گئے —— کچن سے باہر جانے والی نالی صاف کروا کے اس پر چُونے کا چھڑکاؤ کروایا گیا۔ پھر کچن میں گلاب کے پھُولوں والی خُوشبو کا سپرے کروایا گیا اور یوں کچن کی حالت میں وہ اِنقلاب آیا کہ سُورج کی جھم جھماتی کرنیں کھڑکی کی راہ اندر داخل ہوتیں تو برتن جھم جھانے لگتے، دِیواریں مسکرانے لگتیں۔ کچن کی آب تاب، چمک دمک اتنی خیرہ کُن

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہوگئی کہ کوئی بارات اُتر آتی تو اسے حجلۂ عروسی کا نام دے کر دُلہن کو بآسانی یہاں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

لیکن ہماری یہ سب تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ جب چھٹی کے دن کمانڈر نے کچن میں آنے کی بجائے فرائی پین اور مٹی کے تیل کا چولھا اپنے کمرے ہی میں منگوا لیا ــــ بعد میں پتہ چلا کہ مچھلی بھوننا تو محض ایک بہانہ تھا، کمانڈر ایک دن کچن جا نکلے تھے اور اس کی صفائی کروانے کا بہتر طریقہ انھیں یہی نظر آیا تھا کہ کچن میں آ کر مچھلیاں بھوننے کی معصوم سی خواہش کا اظہار کر دیا جائے۔

اِنسان تجربے سے بہت کچھ سیکھتا ہے، سیکھنا بھی چاہیے اور جہاں موقع ملے آزمانا بھی چاہیے۔ ہمیں مچھلیاں بھوننے کے تجربے آزمانے کا موقع کراچی میں مِلا۔

ہُمایوں کہ کراچی میں تعیناتی کے دوران صُوبۂ سِندھ کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر لیفٹننٹ جنرل محمد اقبال خان کے اے ڈی سی کچھ دِنوں کی رُخصت پر گئے اور واپسی تک ان کے فرائض ہمیں سنبھالنے پڑے۔ جنرل اقبال بڑے سخت گیر منتظم تھے۔ ایک بار ایک سینیئر افسر نے ان سے مُلاقات کے بعد پسینہ پونچھتے ہُوئے کہا تھا۔ "کیسا جنرل ہے بھائی! اس کی مونچھوں سے چنگاریاں برستی ہیں چنگاریاں!"

انھی چنگاریوں کی مدد سے ہم نے مچھلیاں بھوننے کا فیصلہ کیا۔ پہلے دن ہی لیاری کے لوگوں کی طرف سے ایک اپیل وصُول ہوئی جس میں مختلف مسائل بیان کر کے جنرل اقبال کو علاقے کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ہم نے جنرل سے منظوری لے کر پریس کو خبر بھجوا دی کہ فلاں دن لیاری کا دورہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اِس دن سے پہلے پہلے راستے صاف، نالیاں مرمت، گندگی کے ڈھیر غائب اور فٹ پاتھ درست ہو چکے تھے۔ معمول کے مطابق کسی طرف توجہ دلائی جاتے تو ہمارا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ مختلف محکموں کے درمیان یہی طے نہیں ہو پاتا کہ یہ ذمّہ داری کس کی ہے۔

اس کے بعد ہمارا یہ معمول رہا کہ جہاں جہاں سے جنرل نے گزرنا ہوتا، ایک دن پہلے متعلقہ محکموں کو خبر کر دیتے۔ کافی حیص بیص بھی ہوتی لیکن آخری نتائج ہمیشہ مثبت ہی رہے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ایک بار ایسا ہُوا کہ رات کے گیارہ بجے متعلقہ محکمے کے افسروں کو بتایا گیا کہ فلاں سڑک پر پانی جمع ہے اور صبح آٹھ بجے جنرل نے وہاں سے گزرنا ہے ــــ آپ جانیں آپ کا کام ــــ دُوسرے دن وہاں سے گزرے تو سڑک آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ ہیڈکوارٹر واپس آئے تو متعلقہ محکمے کے سربراہ کا فون آیا انھوں نے پیشگی اطلاع دینے پر شکریہ ادا کیا۔ پوچھا کہ راتوں رات انھوں نے سڑک کا حُلیہ کیوں کر بدل دیا۔ معلوم ہوا کہ سڑک کے گٹر بند تھے، پہلے انھیں کھلوایا گیا۔ پھر درجنوں خاکروبوں کی مدد سے پانی سُوتا گیا۔ صُبح چھ بجے کام ختم ہو سکا۔

واضح رہے یہ ہماری انفرادی شرارتیں تھیں۔ ان کی بُنیاد پر مارشل لاء کی کارکردگی اور طریقِ کار پر جھوٹی سچی تنقید مناسب نہ ہوگی چلیں واپس استو چلتے ہیں کہ ؎

جہاں عِشق کے امتحاں اور بھی ہیں

بس سیکرٹری بننے کے کچھ عرصے بعد کا ذکر ہے کہ کور کمانڈر کی آمد کا غلغلہ اُٹھا۔ دوسرے افسروں کی مصروفیت اور ہماری فارغ البالی کے پیشِ نظر ان کی آمد پر تمام تر انتظامی امور کی ذمّہ داری ہمارے سپرد کی گئی۔ پہلے تو خندہ پیشانی سے یہ ذِمّہ داری قبول کر لی، لیکن بعد میں جو اس پر غور کیا تو ہم پر منکشف ہُوا کہ ان کی آمد پر پیدا ہونے والے تمام مسائل کی نوعیت امُورِ خانہ داری کی سی تھی جس میں اپنی مہارت کی تفصیلات ہم نے اپنی پہلی کتاب جنٹلمین بِسم اللہ میں بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہیں۔

ڈی کیو تو سارا دن ٹیلیفون سے چمٹے چپکے رہتے تھے۔ (تفصیلات اس کی بعد میں آئیں گی۔) بریگیڈ میجر سے رہنمائی چاہی، تو انھوں نے بریگیڈ کے تدبیراتی جائزے TACTICAL APPRECIATION کے ڈرافٹ غلطیاں چیک کرنے کے لیے ہمارے حوالے کر دیے۔ سو لین قارئین کے لیے تدبیراتی جائزے کا تعارُف کچھ یوں ہے کہ فوج میں یونٹ اور ہر ہیڈکوارٹر کے ذِمّے سرحدوں کے دفاع کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ ذِمّہ داری امن کے دنوں میں ہی اسے بتا دی جاتی ہے۔ تب یونٹ کی تمام صلاحیتیں اس ایک دن کی تیاری میں صرف ہوتی ہیں اور تمام پروگرام یونٹ کے افسروں اور جوانوں کو انھی دنوں کے لیے تیار کرنے کے نقطۂ نظر سے تیار کیے جاتے ہیں

ہم اپنے مسائل کی ادھیڑبن میں مصروف ان جائزوں کی پروف ریڈنگ میں مصروف تھے کہ اچانک ہمیں اپنے تمام مسائل کے جواب ملنے شروع ہوگئے۔

تدبیراتی جائزے میں تو دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کی صورت میں پیش آنے والے مسائل کا نہایت دقتِ نظر سے جائزہ لیا گیا تھا لیکن تھوڑا سا غور کرنے پر انکشاف ہوا کہ زندگی کے کسی بھی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے اگر یہی طریقہ اختیار کیا جائے تو بڑا شافی اور مکمل جواب مِل سکتا ہے۔

چنانچہ ہم نے یہی کیا کہ اس تدبیراتی جائزے کی سُرخیاں تو وہی رہنے دیں جو تھیں البتہ متن اپنی ضرورت کا لکھا۔ اس کے بعد نتائج نکالے جن سے وہ تمام اُمور سامنے آ گئے جن کی انجام دہی ہماری ذِمّہ داری قرار پائی تھی۔ کور کمانڈر کی آمد پر اِنتظامات اتنے شاندار ہُوئے کہ ہم خود بھی ان پر حیران رہ گئے۔ ملاحظہ کیجیے کور کمانڈر کی آمد کا تدبیراتی جائزہ۔

کور کمانڈر کے دَورے کا تدبیراتی تجزیہ

TACTICAL APPRECIATION OF CROPS COMMANDER'S VISIT

عمومی صُورتِ حال

۱۔ کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل .... آئندہ ماہ دسمبر کے دُوسرے ہفتے میں شمالی علاقوں کے تین روزہ دَورے پر گلگت پہنچیں گے۔ دُوسرا دن ہمارے برگیڈ اور ماتحت یونٹوں کے معائنے میں گزرے گا۔

۲۔ اپنے برگیڈ کمانڈر کا پلان یہ ہے کہ تمام یونٹوں کو چوکس اور مستعد رکھا جائے اور

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کور کمانڈر کو برگیڈ کے فعال اور مستعد ہونے کا یقین دلایا جائے۔

مقصد

۳۔ اِس تجزیے کی تحریر کا مقصد

ا۔ کور کمانڈر کے دَورے کا اہتمام احسن طریقے سے کرنے کی منصوبہ بندی۔
ب۔ کور کمانڈر کے قیام کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ بنانا۔
ج۔ اپنے کمانڈر کی پروموشن کے لیے زیادہ سے زیادہ سازگار حالات پیدا کر کے اپنی نوکری فِٹ رکھنا۔

عوامِل

FACTORS

موسم اَور زمینی صُورتِ حال

GROUND AND WEATHER

۴۔ موسم

ا۔ سخت سرد — کور کمانڈر کو پیش کی جانے والی چائے کے ٹھنڈا ہونے کا سخت امکان۔

ب۔ برفباری — شروع ہونے کا خدشہ

ج۔ طوفانِ باد وباراں۔ کی صُورت میں ہیلی کاپٹر واپس نہ جا سکیں گے۔ کور کمانڈر کو اپنے ہاں ٹھہرانے کی مجبوری۔

۵۔ رہائشی سہولتیں

ا۔ مَیس کے کمرے — ناکافی
ب۔ غسل خانے — ناکافی۔ فلش سِسٹم بگڑا ہُوا۔
ج۔ سِول ریسٹ ہاؤس — خالی۔

۶۔ راستہ

ا۔ ہیلی پیڈ سے برگیڈ ہیڈکوارٹر تک	مختصر اور ہموار
ب۔ برگیڈ ہیڈکوارٹر سے میس تک	طویل، پیچیدہ اور دشوار گزار

۷۔ نتائج : DEDUCTIONS

ا۔ چائے کے کپ اور پرچیں آخر وقت تک گرم پانی میں ڈبوئی رکھی جائیں ـــــ چائے دانیوں کے لیے پانچ نئی ٹی کوزیاں خریدی جائیں۔

ب۔ برفباری سے نپٹنے کے لیے دس نئی برساتیاں تیار رکھی جائیں۔ نیز گلگت سے ربڑ کی بوتلیں خرید کر لائی جائیں۔ کور کمانڈر کے قیام کی صورت میں بستر گرم کرنے کے لیے استعمال کی جائیں۔

ج۔ کور کمانڈر کی آمد سے قبل تیس نومبر چار بجے شام تک سول ریسٹ ہاؤس پر مکمل قبضہ کیا جائے۔

د۔ اس کی جھاڑ پونچھ، روشنی اور رہائش کے انتظامات دو دسمبر شام چار بجے تک مکمل کیے جائیں۔

- میس سے ملحق خالی جگہ میں خیموں کے غسل خانے بنوائے جائیں۔
- اپریشن ڈبے کو میجر اور کم رینک کے افسر انہیں استعمال کریں گے۔
- میس کا غسل خانہ اپنے برگیڈ کمانڈر اور آنے والے سینئر افسروں کے لیے مخصوص کیا جائے۔
- ہیلی پیڈ سے برگیڈ ہیڈ کوارٹر تک کے راستے کی دونوں جانب چونا کاری کی جائے اور کور کمانڈر کو پیدل ہیڈ کوارٹر تک لایا جائے۔
- ہیڈکوارٹر سے میس تک جیپیں استعمال کی جائیں۔

۸۔ "مہمان" کی افرادی قوت

ا۔ کور کمانڈر مع اے ڈی سی	۲
ب۔ فورس کمانڈر ناردرن ایریا مع اے ڈی سی	۲

ج۔ پائلٹ	۲
د۔ کور کمانڈر کے ہمراہی کوئی سینئر افسر	۱
غیر متوقع مہمان	۳
کل تعداد	۱۰

۹۔ مہمانوں کی خاص عادات

ا۔ کور کمانڈر عام طور پر چائے پینا پسند نہیں کرتے۔ سبز چائے شوق سے پیتے ہیں۔ سگریٹ کا برانڈ ـــــ پی کے بولڈ۔

ب۔ فورس کمانڈر ناردرن ایریا درویش صفت آدمی ہیں۔ جو دے دو کھا پی لیتے ہیں۔ سگریٹ نوشی سے مکمل پرہیز۔ (الحمدللہ) البتہ فون پر اکثر بیگم سے راولپنڈی بات کرتے پائے گئے۔

ج۔ دونوں پائلٹ یار باش قسم کے آدمی ہیں۔ تاش میں برج کھیلنا پسند کرتے ہیں

۱۰۔ نتائج DEDUCTIONS

مہمانوں کی قوت کو سامنے رکھتے ہوئے مؤثر دفاع کے لیے مندرجہ ذیل خصوصی افرادی قوت اور ساز و سامان کی ضرورت پڑے گی جن کا انتظام کیا جائے۔

ا۔ چاق چوبند اردلی	
برائے کور کمانڈر اور فورس کمانڈر	دو عدد
ب۔ مشاق ڈرائیور	چار عدد
	(ملاحظہ ہو پیرا ۶ شق ب)

ج۔ ساز و سامان

(۱) سبز چائے کے ڈبے	دو عدد
(۲) پی کے بولڈ سگریٹ	بارہ پیکٹ
(۳) ٹیلیفون سیٹ	دو عدد

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

برائے کور کمانڈر اور فورس کمانڈر		برگیڈ سگنل کمپنی کمانڈر یقین کرے کہ سونے سے پہلے فورس کمانڈر کی کال راولپنڈی ضرور ملائی جائے۔ ملاحظہ ہو پیرا ۹ شق ب
۴۔ شیونگ کٹ	دو عدد	برگیڈ کے حجام کو بھی سٹینڈ ٹو رکھا جائے۔ اسے اپنے آلات تیز رکھنے کی ہدایت بھی کی جائے۔
۵۔ گدے، لحاف، بستر کی چادریں اور تکیے	دس عدد	ہر آئٹم
۶۔ سلیپنگ سوٹ	دو عدد	برائے کور کمانڈر اور فورس کمانڈر۔ باقی افسر مقامی افسروں کے تعاون سے کام چلائیں
۷۔ سلیپر	دو عدد	
۸۔ جگ اور پانی کا گلاس	〃	
۹۔ لکھنے کا پیڈ	〃	
۱۰۔ قلم	〃	
۱۱۔ ٹیبل لیمپ	〃	
۱۲۔ گیس لیمپ	〃	
۱۳۔ تاش کے نئے پیکٹ	〃	

د۔ __پائلٹوں کا استعمال__ — قیام کی صورت میں پائلٹوں کے استعمال کے لیے ملاحظہ ہو پیرا ۱۴ شق ج

۱۱۔ اپنی افرادی قوت اور حوصلے کی حالت

ا۔ برگیڈ کمانڈر	فکرمند لیکن بھرپور اعتماد۔ مسلسل ہدایات جاری دیں۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر زبردست ڈانٹ ڈپٹ۔ برج کھیلنے کا جنون کی حد تک شوق۔
ب۔ برگیڈ میجر	برگیڈ کمانڈر کی مسلسل ہدایات سے نالاں۔ برگیڈ کے ٹیکنیکل پلان بنانے میں سر کھپانے کی فرصت نہیں آنے والی ٹیم کے قیام کی صورت میں برگیڈ کمانڈر اور پائلٹوں کو ملا کر برج کھیلنے کے شوقین کھلاڑی کل تین بنتے ہیں۔ بی ایم کو اگرچہ کھیلنا آتا ہے لیکن امکان ہے کہ وہ راقم الحروف کو پھنسا کر خود بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔
ج۔ ڈپٹی اسسٹنٹ ایڈجوٹنٹ اینڈ کوارٹر ماسٹر جنرل	پردموشن زدن میں — خاصے بوکھلاتے ہوئے برگیڈ کے ایڈم پلان بنانے میں مسلسل قلابازیاں — ایریشن ڈے کو حواس باختہ ہونے کے عین امکانات۔
د۔ برگیڈ سگنل کمپنی کمانڈر	ٹیلیفون لائنوں کو درست رکھنے کے بارے میں مشوش روزانہ جگہ جگہ سے تاروں کے معائنے کے لیے مسلسل سفر۔
جی تھری ایجوکیشن (راقم الحروف)	فارغ البال — برج کے کھلاڑی۔ قیام کی صورت میں بی ایم کے ہاتھوں برج ٹیبل پر گھیراؤ کا امکان

۱۲۔ ذخیروں کی صورت حال اور خوراک کے ذرائع

ا۔ میس میں کھانے پینے کی اشیاء کا سٹاک قریب الختم۔
ب۔ مقامی بازار میں کور کمانڈر کے شایانِ شان چیزیں ناپید۔
ج۔ گلگت میں اشیائے خورد و نوش کی فراوانی۔

۱۳۔ نتائج DEDUCTIONS

میدانِ جنگ یعنی ڈائننگ ہال میں اپنی اور دشمن کی افرادی قوت جمع کی جائے تو کل نفری پندرہ بنتی ہے۔ فیصلہ کن نتائج (ملاحظہ ہو پیرا ۳ شق ج) کے لیے مندرجہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ذیل سامان کی ضرورت پڑے گی :-

و۔ ڈائننگ ہال کا سامان

(۱) کرسیاں	پندرہ عدد	
(۲) جگ	پانچ عدد	
(۳) گلاس	بیس عدد	(ٹوٹنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔)
(۴) چاول کی بڑی پلیٹیں	〃	〃
(۵) کوارٹر پلیٹیں	〃	〃
(۶) ہاف پلیٹ	〃	〃
(۷) بڑے چمچے	〃	(میز سے زمین پر گرنے کی گنجائش)
(۸) چھوٹے چمچے	〃	〃
(۹) کانٹے	〃	〃
(۱۰) نیپکن	〃	(ایک سے زائد استعمال کرنے کی گنجائش)
(۱۱) گلدان	چار عدد	

ب۔ ڈائننگ ہال کے باہر کا سامان

(۱) چلمچی ہاتھ دھونے کے لیے	ایک عدد	
(۲) حمام	〃 〃	پانی قابلِ برداشت حد تک گرم رکھا جائے۔
(۳) صابن	دو ٹکیاں	
(۴) تولیے بڑے	چار عدد	
(۵) تولیے چھوٹے	پندرہ عدد	کھانے سے پہلے گرم پانی میں بھگو کر ہاتھ صاف کرنے کے لیے استعمال کیے جائیں۔

ج۔ کچن کے لیے اضافی سامان کی ضرورت

(۱) چکن	دس عدد	(زیادہ کھانے والے افراد کے لیے گنجائش)

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

(۲) چاول	چار کلو	(زیادہ کھانے والے افراد کے لیے گنجائش)
(۳) مکھن	دو پونڈ	(صرف کھانے کیلیے استعمال کیا جائے)
(۴) ڈبل روٹی	آٹھ عدد	(سینڈوچز کے لیے)
(۵) انڈے	پانچ درجن	〃
(۶) اچار کی بوتلیں	چار عدد	
(۷) جام کی	〃	〃

۱۴۔ پیرا ۱۱ اور ۱۲ سے اخذ کردہ نتائج

و۔ اپریشن ڈے تک برگیڈ کمانڈر سے براہِ راست ملاقات سے مکمل پرہیز ضرورت پڑنے پر بی ایم کی وساطت سے ہدایات وصول کی جائیں۔

ب۔ برج کے ماہر کرنل انعام کو جو صرف چھ میل دُور گوری کورٹ میں متعین ہیں کسی بہانے اپریشن ڈے کو اسٹور بلوا کر ریزرو میں رکھا جائے۔

(تجویز پیش کی جاتی ہے کہ کور کمانڈر کی آمد کے موقع پر ارد گرد کے سینیئر افسروں کو یہیں بلوا لیا جائے ـــ وہ کمانڈر کو ایسکارٹ کر کے اپنے اپنے یونٹوں کو لے کر جائیں۔)

ج۔ قیام کی صورت میں دونوں پائلٹوں اور کرنل انعام کی شکل میں برج کے تین بہترین کھلاڑی میسّر آتے ہیں۔ برج کی بات چلنے پر تینوں کے نام پہلی فرصت میں برگیڈ کمانڈر کو پیش کیے جائیں۔

د۔ اپریشن ڈے کو ڈی کیو سے فاصلے پر رہا جائے۔

- میس میں کھانے پینے کی روزمرہ کی اشیاء اور پیرا ۱۳ شق ج میں درج اشیاء کی خریداری کے لیے گلگت سے شاپنگ کی جائے۔
- پیرا ۱۱ شق ب، ج، د کی روشنی میں شاپنگ کے لیے موزوں ترین آدمی : راقم الحروف۔

بدحواسیاں

ہم ایم اے صحافت کیا ہوئے، ہر درد کی دوا ہو گئے۔ کسی صاحب کو کسی لفظ کے ہجے پوچھنا ہوتے وہ ہم سے مخاطب ہوگا۔ "کیوں بھئی آپ صحافی ہیں اور اخباروں میں صحیح الفاظ کی اشاعت کا بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ یہ مینور MANOEUVRE کے کیا سپیلنگ ہیں؟"

کسی صاحب کو تلفظ کے بارے میں اشتباہ ہوا۔ سیدھا چلا آئے گا، "بھئی آپ لوگوں کا تو بڑے بڑے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے۔ بڑا تجربہ ہے آپ کا۔ ای ایکس ٹی ای ایم پی او آر ای EXTEMPORE کا صحیح تلفظ ایکس ٹیمپور ہے یا ایکس ٹیمپرے؟"

برطانیہ نے ڈیگو گارشیا کے جزائر امریکہ کے حوالے کیے۔ شامت ہماری آئی۔ "بھئی آپ لوگوں کی تو نظر رہتی ہے دُنیا کے نقشے پر۔ کہاں ہے یہ جزیرہ؟ ہم سے کتنی دُور ہے؟ ہماری صحت پر کوئی اثر پڑے گا اس کی ملکیت بدلنے سے؟"

چھٹی کا دن ہے، سردیوں کے دن۔ آفیسرز میس کے لان میں کرسیاں بچھائے نرم نرم دُھوپ میں اخباروں کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ کسی اخبار نے کسی خوبصورت اداکارہ کی بڑی سی تصویر چھاپ دی ہے اس کی جنسر ساما نیوں کو نمایاں کرتے ہوئے یا "اسلام آباد میں منعقد ایک تقریب میں شریک خواتین" کے مختلف پوز دے دیے ہیں تو ہم بلا مقابلہ صحافیوں کی تمام انجمنوں کے واحد نمائندے قرار پائیں گے اور ملکی صحافت کے حوالے سے ساری صلواتیں ہمیں سننی پڑیں گی۔ کبھی کبھار کوئی اچھا کاٹ دار کالم چھپ جاتا تو کالم نگار کی طرف سے شاباش وغیرہ بھی ہمیں وصول کرتے۔ محترم عبدالقادر حسن، احمد ندیم قاسمی، الطاف حسن قریشی، عطاءالحق قاسمی، انعام دُرّانی، منو بھائی اور نسیمہ بنت سراج کو ہمارا اسلام پہنچے کہ وہ چاہیں نہ چاہیں ہم ان کی طرف سے داد و تحسین وصول کرتے رہے۔ رہی گالیاں تو وہ ہم ایک کان سے سُن کر دُوسری سے اُڑاتے رہے، کسی اور کی طرف کیا منتقل کرنی۔

ویسے صحافت کے حوالے سے ملکی سیاست کے اتار چڑھاؤ نے ہمیں ذاتی طور پر بُری طرح متاثر کیا۔ ۱۹۷۷ء کے موسم بہار کا ذکر ہے، ملک خزاؤں کی زد میں تھا۔ وقت کے وزیر اعظم نے بڑے بڑے شہروں میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ فوج نے نظم و نسق سنبھالا تو پریس سے رابطہ رکھنے کے لیے افسروں کی ضرورت پڑی۔ فوج کے محکمہ تعلقاتِ عامہ کی نظرِ انتخاب ہم پر پڑی۔ اِس محکمے کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں جس افسر پر انگلی رکھ دیں، وہ ان کا ہو جاتا ہے۔ جس سے رُوٹھ جائیں، ویرانیاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔ اِن دنوں ہم شہری آبادیوں سے کہیں دُور گلگت سے بھی اسّی میل پرے استور میں تعینات تھے اور دِن رات ڈنڈ بیٹھکوں میں مصروف کہ فضاؤں میں اُڑنے کی تمنا میں لڑ جھگڑ کر پیراشوٹ جمپ کورس حاصل کیا تھا اور ہم جسمانی طور پر خُود کو فولاد بنانے میں مصروف تھے کہ پیراشوٹ جمپ کورس میں جہاز سے چھلانگ لگانے کی باری تو بڑی دیر میں آتی ہے۔ سکول والے اس سے پہلے انتہائی سخت تربیت کی کٹھالی سے گزارتے ہیں۔ ہم تیاریوں میں تھے کہ ایک دن اچانک حکم نازل ہوا کہ فوراً کراچی پہنچو اور پریس سے جائز قسم کے تعلقات کی بنیاد ڈالو۔

ہم ذہنی طور پر فضاؤں میں پرواز کر رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی تین مرتبہ ہمیں یہ کورس الاٹ ہوا تھا لیکن عین وقت پر کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہو جاتا تھا اور ہم منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سب سے پہلے فیصلہ یہی کیا کہ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے، اس بار یہ کورس کر کے رہیں گے۔ سب سے پہلے برگیڈ کمانڈر برگیڈیر داؤد سے مذاکرات کیے۔ مارشل لاء پر ڈیوٹی کی صورت میں ہمیں تنخواہ سے زائد سینکڑوں روپے ہاتھ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

آنے تھے (بصورت مارشل لاء الاؤنس) اور کورس پر جانے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ ہمیں پیسے پلّے سے خرچ کرنے پڑتے تھے بلکہ خدانخواستہ کوئی بازو اُتر جاتا، ٹانگ ٹوٹ جاتی، جہاز سے چھلانگ لگانے کی صورت میں کان اُڑ جاتا تو فوج پر کسی قسم کی ذمّہ داری نہ تھی۔ معذور ہونے کی صورت میں نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے لیکن شوق داکوئی مل تیں۔ ہم جہاز سے براہِ راست فضاؤں میں اُترنے کا تجربہ بنفسِ نفیس کرنا چاہتے تھے۔ اِس کے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھے اور ہر مالی فائدہ ٹھکرانے کے لیے مستعد۔ بریگیڈ کمانڈر کو ہماری بات پسند آئی۔ ہماری چھٹی کی درخواست جو ہم نے جی ایچ کیو کے سگنل موصول ہونے کی تاریخ سے ایک دن پہلے دائر کی تھی، منظور ہوئی اور ہم رُخصت پر قرار دے دیے گئے۔ جی ایچ کیو کو اطلاع دی گئی کہ افسر رُخصت پر ہے۔ کراچی کے لیے کسی اور کو تلاشا جائے۔ صبح سگنل گیا تھا۔ رات گئے ڈپٹی ملٹری سیکرٹری کا ٹیلیفون آیا کمانڈر کے نام: "افسر کی چھٹیاں منسوخ کر دی جائیں اسے فوری طور پر ہدایت کی جائے کہ وہ گھر سے سیدھا کراچی پہنچے۔"

دُوسرے دِن ایک جیپ ہمیں لیے گلگت کی طرف رواں دواں تھی۔ جہاں سے پنڈی پرواز کے لیے ہماری سیٹ راتوں رات بُک ہو چکی تھی۔ پنڈی پہنچے۔ آئی ایس پی آر سے بریفنگ لی اور پی آئی اے سے کراچی کی ٹکٹ۔ شام سے پہلے ہم تینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے تھے۔ لاہور میں ڈیڑھ گھنٹے قیام کے بعد جہاز نے رن وے چھوڑا تو سرمئی شام کا کاجل گہرا ہو چکا تھا۔ ایر ہوسٹس سے مصنوعی مسکراہٹوں کے تبادلوں کے بعد ہم نے آنکھیں موند لیں اور پیرا جمپ کورس کے نکلتے ہوئے موقع کو قابو میں لانے کی تدابیر سوچتے ہوئے مستقبل قریب پر غور کرنے لگے۔ ہم کراچی جا رہے تھے۔ پاکستان کا وسیع ترین شہر، وسعتوں میں سمندر، جلووں میں یکتا۔ لاکھوں کی غربتیں چھپائے جگمگاتا رہتا ہے۔ حدیثِ رسولؐ ہے "جب تمھارے شہر کی آبادیاں بڑھنے لگیں تو نئی بستیاں آباد کرو۔" چھوٹی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

بستیوں میں لوگ ایک دُوسرے سے آشنا ہوتے ہیں۔ دُکھ سُکھ میں ایک دُوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔ غم آتے ہیں تو مِل کر بانٹ لیتے ہیں خوشیاں آتی ہیں تو چاروں اور بکھر جاتی ہیں۔ سادہ لوگ سادہ باتوں میں خوش رہنے کے پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ محترم احمد ندیم قاسمی نے کیا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے۔ سادہ زندگی کے سادہ دل لوگوں کا ؎

وُہ بانکے ترچھے چرواہے   یوں پھرتے ہیں میدانوں میں
جیسے رنگیلی تیتریاں   منڈلاتی ہیں بستانوں میں

لیکن جب شہروں کی آبادیاں بڑھنے لگتی ہیں تو معصومیت رُخصت ہو جاتی ہے اور ہر طرف مکر و فریب کے جالے بُنے نظر آتے ہیں۔ بیگانگی کا یہ عالم کہ دروازے سے دروازہ ملا ہے، مہینوں تک تعارف نہیں ہو پاتا، کوئی دُکھ کا شریک نہ سُکھ کا ساتھی۔ اچھّے بھلے شہر میں ؎

جس سمت آنکھ اُٹھے ہے صحرا دکھائی دے

دیوہیکل جہاز بادلوں کی اوٹ سے نکل کر ایرپورٹ پر جھکا تو رات اپنا آنچل پھیلا چکی تھی۔ شہر کی روشنیاں جگمگ ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہم روشنیوں کی طرف بڑھے اور سنسان راہوں پر اُتر گئے۔ جہاز ٹیکسی کرتا ہُوا ہمیں پھر رونقوں میں لے آیا۔ باہر نکلے تو کراچی کی مخصوص ہوا نے اِستقبال کیا۔ اِنتظار گاہ میں آ کر ہم کسی آدمی کے متلاشی ہُوئے جو ہمیں لینے آیا ہو۔ مایوسی ہُوئی۔ متحرک بیلٹ پر اٹیچی نظر آیا تو اسے اٹھائے باہر آ گئے۔

شہر میں ہنگامی حالت کا نفاذ تھا۔ پنڈی سے فون اِسی لیے کیا تھا کہ کوئی ایرپورٹ سے ہی آ کر لے جائے ہمیں۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ نیوی کی ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ "چیک تو کرنا چاہیے کس کے لیے آئی ہے" قریب گئے ڈرائیور ندارد۔ اِنتظار گاہ کی طرف آئے۔ ایک بُوڑھا نظر آیا، لحیم شحیم گھیر دار شلوار اور لمبی سی قمیص پہنے ہُوئے۔ وہ شیشے کی دیوار پر ناک کے بل جھکا ہُوا مسلسل ایک سمت میں دیکھ رہا تھا۔ ہم نے اس کی

نظروں کی سیدھ میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹارگٹ چند نوجوان لڑکیاں تھیں کہ شباب جن کا زور آور اور ہنسی نقرئی گھنٹیوں کو مات کرتی تھی۔ لباس میں قوسِ قزح کے رنگ، نکھلے در چہروں پر میک اَپ کی لالیاں۔ ہم بوڑھے کے قریب گئے، دیکھا دائیں ہاتھ میں نیوی کی ٹوپی پکڑ رکھی ہے۔ یقین ہوا کہ جیپ کا ڈرائیور یہی ہے۔ ہوں ہاں کر کے اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ جانے کب کی بھوک مٹا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ٹوپی لے لی، کوئی جنبش نہ ہوئی۔ اس ٹوپی سے اس کے چہرے کو ہوا دی تو وہ ہڑبڑایا۔

پُوچھا "کسے لینے آئے ہو؟"

"سر کیپٹن اشتیاق ہیں کوئی۔ لاہور سے آنا تھا انھیں۔"

اشتیاق تو اس نے شاید نام کی مشابہت کی وجہ سے بنا دیا تھا۔ البتہ لاہور سے آنے کی اطلاع اسے غلط مِلی ہوگی۔ شاید کسی نے بتایا ہو کہ وہ لاہور کے رہنے والے ہیں۔ ہمیں یقین ہوگیا کہ گاڑی ہمارے لیے بھیجی گئی ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

"اٹھاؤ اٹیچی" ہم نے حکم دیا۔ بُوڑھے نے سرِ تسلیم خم کیا۔

تھوڑی دیر میں ہم شاہراہِ فیصل پر فراٹے بھر رہے تھے۔ جب جیپ کافی دیر تک چلتی رہی تو ہم نے بُوڑھے ڈرائیور سے پُوچھا:

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

ڈرائیور نے ہماری طرف جھکتے ہُوئے ایک ایک لفظ سلو موشن میں ادا کرتے ہوئے پوچھا:

"آپ نے کہاں جانا ہے؟"

"ہمیں تو کچھ پتہ نہیں۔"

"آپ افسر ہیں؟"

"ہاں۔ کیوں۔ کوئی شبہ ہے تمھیں؟"

"جب آپ کو افسر ہوتے ہوئے نہیں پتہ کہ کہاں جانا ہے تو مجھ غریب کو کیا معلوم کہ آپ کہاں جائیں گے؟"

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہم ٹپٹا گئے۔ پھر گویا ہوئے۔

"میرا مطلب ہے کہ ہمیں کس مَیس میں ٹھہرایا گیا ہے۔"

"سر بتایا تو تھا انھوں نے لیکن میں ذرا اُونچا سُنتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آئی۔ میرا خیال تھا آپ اَفسر ہیں اور افسروں کو تو ہر بات معلوم ہوتی ہے۔"

ہم اس کے خیال کی نفی کرتے تو افسری سے محروم ہوتے تھے۔ بے چارگی سے اسے دیکھا اور بتایا کہ کور آفیسرز مَیس چلو۔ کور ہیڈکوارٹر کراچی میں سینیئر ترین ہیڈکوارٹر تھا اور کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل جہانزیب اَرباب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر۔ ہم مارشل لاء ڈیوٹی پر آ رہے تھے اور کور ہیڈکوارٹر کو ہماری خبر ہونی چاہیے تھی۔ مَیس پہنچے وہاں کور کے جی تھری ٹریننگ کیپٹن طارق سے مُلاقات ہُوئی۔ اس نے بڑی نرمی اور پیار سے سمجھایا کہ مَیس تو افسروں سے پَٹا پڑا ہے۔ قطعی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا انکار بھی پیارا لگا۔ دو تین اور مَیسوں کے پتے لیے اور جیپ میں آن بیٹھے۔ سروسز کلب، ٹرانزٹ کیمپ، کور ہیڈکوارٹر غرض ہر جگہ پتہ کیا لیکن بے سُود۔ رات کا ڈیڑھ بجا تھا جب ہم کو تیمز روڈ پر واقع نیوی کے ایک مَیس دلادر پہنچے۔ ہُو کا عالم ہر سو اندھیرا —— ہم نے رہائشی عمارت کا چکر لگایا۔ تمام دَروازے بند، روشنیاں گُل —— تاہم دُوسری منزل پر ایک کمرے سے دُودھیا روشنی پھُوٹ رہی تھی۔ اُوپر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دروازہ چوپٹ کھُلا ہے، کمرہ دُھلا دُھلایا، صاف شفاف —— قرینے سے بستر لگا ہے، اُجلی چادریں بچھی ہیں، نرم گدا، ملائم تکیہ۔ پنکھا چل رہا ہے۔ سب کچھ موجُود لیکن آدم نہ آدم کی ذات۔ ہم نے اِدھر اُدھر پکارا، "کوئی ہے۔ کوئی ہے؟"

جب کوئی جواب نہ مِلا تو اوپر ہی سے ڈرائیور کو آواز دی کہ سامان لے آؤ۔ وہ سامان لے آیا اور پوچھا، "سر یہی ہے آپ کا کمرہ؟"

"معلوم نہیں۔ لیکن فی الحال ہم یہیں قیام فرمائیں گے۔ تم صبح نو بجے آجانا جیپ لے کر۔ پھر چلیں گے اصلی ٹھکانے کی تلاش میں۔"

ڈرائیور سیلوٹ کر کے رُخصت ہوگیا۔

ہم نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ سُوٹ کیس کھولا اور باتھ رُوم میں گھس گئے۔ فینسی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں باتھ روم چکا چوند ہو رہا تھا۔ شاور کھولا تو زندگی بخش پانی کے فوارے برسنے لگے۔ نہا کر واپس آئے۔ بیڈ روم کی پچھلی کھڑکی کھولی تو عجب جانفزا منظر تھا۔ میس بالکل سمندر کے کنارے واقع تھا۔ چاند کی روشنی میں سمندر کی لہریں پارے کی طرح مچل رہی تھیں۔ بائیں جانب میس کی سفید عمارت تھی۔ بیرونی دیوار شیشے کی بنی ہوئی تھی اور چاندنی اس سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی تھی۔ رہائشی عمارت کے نیچے پائیں باغ تھا جس میں خوبصورت سرسبز گھاس تھی، سلیقے سے کٹی ہوئی باڑ، قرینے سے بنی ہوئی رَوِشیں اور لہلہاتے، جھومتے مُسکراتے یہ بڑے بڑے پھُول۔ ساری تکان کا ماحصل یہ خوبصورت منظر تھا۔ دیر تک ہم کھڑے دیکھا کیے پھر اسی منظر کو آنکھوں میں بسائے بستر پر دراز ہو گئے۔

دن چڑھے کسی کی مؤدّب دستک سے آنکھ کھُلی۔ مزے کی گہری نیند کے بعد انگڑائی لینے میں بھی ایک نشہ سا ہوتا ہے اور اس کی مستیوں کو وہ لوگ کیا جانیں جو اپنے ہاتھوں بے خوابیاں مُول لے لیتے ہیں۔ ہم پر بھرپور نیند کا خمار طاری تھا۔ انگڑائی لی۔ پھر اُٹھ کر کھڑکی کے باہر جھانکا۔ پھولوں کی خُوشبوؤں سے معطر ہوا کے جھونکوں نے چہرے کو چھُوا تو نشہ دو آتشہ ہو گیا۔

دروازے پر پھر دستک ہُوئی۔

"YES" ہم نے آنے والے کو اندر آنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

دروازہ کھُلا۔ میس حوالدار اپنی مخصوص وَردی میں کھڑا تھا۔ بولا:

"سر! کمانڈر ..... ناشتے پر آپ کا اِنتظار کر رہے ہیں۔"

"کمانڈر ہمارا اِنتظار کر رہے ہیں۔ یعنی کیپٹن اشفاق کا؟"

"کیپٹن اشفاق کا نہیں سر! کیپٹن اِشتیاق کا۔ آپ کیپٹن اشتیاق ہیں نا؟"

اور ہمارا نشہ ایک دم ہرن ہو گیا۔ میس حوالدار سے معلوم ہوا کہ وہ نیوی کے کسی کیپٹن اِشتیاق کی لاہور سے آمد کے منتظر تھے۔ نیوی کا کیپٹن فل کرنل کے برابر ہوتا ہے

یہ سارا اہتمام انہی کے لیے تھا جسے ہم نے بڑے کر و فر اور اِطمینان کے ساتھ برتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ان کے لیے مخصوص کیے گئے کمرے میں اِستراحت فرمائی تھی بلکہ ایئر پورٹ سے ان کی جیپ بھی لے اُڑے تھے۔ جانے انھوں نے رات کہاں بسر کی ہو گی اور شاید تھوڑی دیر میں وہ پہنچا ہی چاہتے ہوں۔ ہم پریشانی ہی میں تھے کہ آئی ایس پی آر کے لیفٹیننٹ چغتائی ساتھ والے کمرے سے برآمد ہُوئے اور ہمیں دیکھ کر لگے حیرانیوں کا اظہار کرنے۔

"میں رات گئے تک تمھارا اِنتظار کرتا رہا۔ تم کہاں رہے؟"

"رہا تو میں یہ ساتھ والے کمرے میں لیکن آپ .... اِنتظار کی بجائے اگر ایئر پورٹ چلے آتے تو ______؟"

ہم نے سامان اُٹھایا اور چغتائی صاحب کے کمرے میں منتقل ہو گئے۔

دُوسرے دن ہم میس میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ سامنے بیٹھے ہُوئے نیوی کے کیپٹن کی وَردی پر لگی ہُوئی نام کی تختی سے اِنکشاف ہوا کہ موصوف ہی کیپٹن اِشتیاق ہیں۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہُوئے کسی سینیئر افسر کو بتا رہے تھے۔

"ہوائی اڈے سے میں نے ٹرانسپورٹ میں فون کیا کہ کوئی گاڑی بھیج دو۔ بتایا گیا کہ اس نمبر کی جیپ ایئر پورٹ گئی ہُوئی ہے۔ میں نے اسے تلاش کیا۔ جب اس پر نظر پڑی تو وہ کار پارک سے نکل کر ٹریفک میں شامل ہو رہی تھی۔ کوئی صاحب بیٹھے تھے اگلی سیٹ پر ______ میں آوازیں ہی دیتا رہ گیا اُس نے ایک نہ سُنی۔"

ہم نے بھی بچ بچ کر کے اظہارِ تاسف کیا اور ڈرائیوروں کی حماقت کے ایک دو قِصّے پُوری شرح سے بیان کیے۔ مثلاً یہ کہ میں ایک دفعہ ڈیوٹی پر ایک شہر گیا۔ ایئر پورٹ سے آتے ہُوئے ڈرائیور سے پوچھا کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو تو اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر پوچھا:

"سر آپ کو زحمت تو بڑی ہُوئی ہو گی۔ رات کہاں گزاری آپ نے؟"

"آدھی رات میں کہاں مارا مارا پھرتا۔ میرے ماموں ہیں ملیر میں ان کے ہاں چلا گیا تھا۔"

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہم نے سکون کا سانس لیا — یہ تھا سرکاری دَورے پر شہر کراچی میں ہمارا پہلا نزول۔

مختصر بریفنگ کے بعد ہم بُری طرح سرکاری کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دن رات کرفیو کا نفاذ تھا۔ پُورے شہر میں فوج پھیلی ہُوئی تھی۔ جگہ جگہ عوام سے آنکھ مچولی ہوتی۔ پُورا شہر مختلف "جزیروں" میں بٹا ہُوا تھا۔ لالوکھیت (لیاقت آباد) کو لوگ ویت نام کہتے تھے کہ وہاں کے تیز طرار لڑکے بالے تین ہٹی کے پُل پر رکاوٹیں کھڑی کر دیتے اور ہر آنے جانے والے سے مذاقاً "پاسپورٹ" طلب کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں عوام کی اصلی حکومت ہے کسی کا سِکّہ نہیں چلے گا۔ فوجی ٹرک آتے تو وہ ساتھ والی گلیوں میں غائب ہو کر کچھ دیر بعد پھر نمودار ہو جاتے۔ فریسکو چوک کا نام "سٹالن گراڈ" میدان تھا اور چاکیواڑہ کا "کوریا۔"

شام کو وزیرِ اعلیٰ مُصطفےٰ جتوئی کی رہائش گاہ پر ایک کانفرنس ہوتی۔ فوج، پولیس، اِنٹیلی جینس اور دُوسرے متعلقہ محکموں کے نمائندے اس میں موجود ہوتے۔ دِن بھر کی صُورتِ حال پر غور ہوتا اور آئندہ کے لیے امن قائم رکھنے کے منصُوبے بنتے۔ ہمارا کام تھا فوج، پولیس اور عوام کے درمیان آنکھ مچولیوں کو "ذرا" نرم الفاظ میں بیان کرتے ہُوئے سرکاری پریس ریلیز تیار کرنا، اجلاس میں کیے گئے ان فیصلوں کو عوام تک پہنچانا جن کا جاننا مفادِ عامّہ کے لیے ضروری ہو، کرفیو کے اَوقات بذریعہ پریس مشتہر کرنا۔ عوام سے امن قائم رکھنے اور "شرپسند" عناصر کا قلع قمع کروانے میں انتظامیہ کی مدد کی اپیل۔ معاشرے کے مختلف طبقوں اور فوج کے نمائندوں میں جو مذاکرات ہوتے، ان کی خبریں تیار کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ہم جو پریس ریلیز تیار کرتے اس میں مختلف مرحلوں پر اتنی "اصلاح" ہوتی کہ پریس کو جانے تک پریس ریلیز کچھ سے کچھ ہو جاتا۔ ہمیں صُورتِ حال سمجھنے، غور فرمانے یا پوزیشن لینے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑی مشین پورے زور شور سے چل رہی ہے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اور ہمیں لاتے ہی کسی گراری کے ساتھ بطور نٹ، فِٹ کر دیا گیا جس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی بس گراری کے ساتھ گھومتا رہتا ہے، چکراتا رہتا ہے۔ صبح سویرے ہڑبڑا کر اٹھتے، تیر کی طرح باتھ رُوم، وَردی، مَیس سے ناشتہ اور پھر ایک گاڑی ہمیں لے کر مصروفیات کی بھبڑ میں گم ہو جاتی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ہر نیوز بلیٹن سے پہلے ہمارا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا تھا کہ ایک طرف ہماری یہ ذِمّہ داری تھی کہ پریس ریلیز حُکامِ بالا سے منظور کروا کے جاری کیا جائے، دُوسری طرف یہ کہ اہم خبروں کو ہر بلیٹن میں جگہ ملے۔ ہم کس کس کو نیوز بلیٹن سے پہلے کا طریقِ کار سمجھاتے اور کس کس کو آمادہ کرتے کہ وُہ پریس ریلیز نیوز بلیٹن سے کم از کم ایک آدھ گھنٹہ پہلے منظور فرما دیا کریں۔ چکی کے دو پاٹ تھے، حکامِ بالا اور صحافی برادری، جن کے درمیان ہم پِس رہے تھے۔ رات گئے لوٹتے تو جسم تھکن سے چُور ہوتا۔ اِن دنوں احمد ندیم قاسمی صاحب سے مُلاقات ہو جاتی تو وہ یقیناً اپنا یہ شعر ہمارے نام ہی کر دیتے ؎

چاند اس پار افق پہ ڈُوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

لیکن قاسمی صاحب سے مُلاقات ہونی تھی نہ ہُوئی۔

کچھ مُلاقاتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی انسان خواہش کرتا رہتا ہے، جن کی تمنّا میں جیتا رہتا ہے، سلگتا رہتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ جن سے ملنا چاہے وہ اس کے آس پاس چلتے پھرتے، ہنستے مُسکراتے، سمٹتے سنبھلتے اور شرماتے رہتے ہیں لیکن ملاقات نہیں ہو پاتی۔ بس کبھی کبھی نظریں مِل جاتی ہیں، جھک جاتی ہیں اور بس۔ بات ایسی رُومانوی ملاقاتوں کی ہوتی تو خیر تھی لیکن مسئلہ یہ آن پڑا کہ صحافیوں سے ملاقاتیں کرنا ہمارے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ قاسمی صاحب خُوبصورت شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صحافی بھی ہیں۔ ان سے مُلاقات نہ ہو سکنا اپنی جگہ قابلِ افسوس سہی لیکن ان کے دوسرے صحافی بھائیوں سے نہ ملنا ہمیں کبھی کبھار بہت مہنگا پڑا۔

ڈیوٹی سنبھالنے کے تیسرے چوتھے دن کی بات ہے۔ دن بھر کا کام ختم کر کے

ہم دس بجے کے قریب واپس آئے۔ نہا دھو کر بستر پر لیٹے اور عادتاً دن بھر کے کاموں کا ایک جائزہ لیا....... اور اچانک جیسے ہمیں کرنٹ سا لگ گیا ہو۔ بستر سے چھلانگ لگائی اور لباس تبدیل کرنے لگے۔

کراچی میں رات کے سات سے دس بجے تک کے علاوہ باقی اوقات میں کرفیو نافذ رہتا تھا۔ دُوسرے دِن جمعہ تھا اور فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ جمعے کے اوقات میں بھی کرفیو اُٹھا دیا جائے۔ ہم باقی ساری خبریں تو پریس کو دے آئے تھے لیکن یہی ایک خبر دفتر میں ٹائپ ہونی رہ گئی تھی۔ کچھ اور اہم کام ایسے تھے کہ ہم اس کے مکمل ہونے کا انتظار نہ کر سکتے تھے۔ خیال تھا کہ باقی کام نبٹا کر اسے پریس کو جاری کر دیں گے لیکن پھر بھُول گئے۔ اب یاد آئی تو دُوسرے دن کے متوقع مناظر نے دِل دہلا دیا۔ عوام ویسے بھی سر پر کفن باندھے ہُوئے تھے۔ جمعے کی ادائیگی ان کے نزدیک فرضِ عین تھا۔ جنھیں کبھی نماز کی توفیق نہ ہُوئی تھی وُہ بھی نمازی بنے ہُوئے تھے۔ مقصد محض تماشا دیکھنا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ہمارا کام اصلی اور نقلی نمازیوں میں تفریق نہیں بلکہ کرفیو اُٹھائے جانے کے اوقات کی تشہیر تھی۔ جس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ فوجی دستوں کو معلوم ہو جاتا کہ نماز کے اوقات میں انھیں سڑکوں سے ہٹ جانا ہے۔ انھیں تمام احکام گرچہ تحریراً پہنچائے جاتے ہیں لیکن خبر نشر ہونے سے یہ بات یقینی ہو جاتی کہ "فریقین" تک اصل فیصلہ پہنچ گیا ہے۔ دُوسرے دن خدانخواستہ غلط فہمی کی بنا پر کسی بھی مسجد کے سامنے فوج اور عوام میں جھڑپ ہو جاتی تو ذِمّہ داری سراسر ہم پر عائد ہوتی تھی۔

ہم سیدھے فون کی طرف لپکے، ڈائری کھولی، روزنامہ مشرق کا نمبر نظر پڑا، ڈائل گھمایا، جلدی سے نیوز ڈیسک مانگا۔ مِل گیا کوئی صاحب تھے۔ گھبرائے گھبرائے لہجے میں انھیں کہا:

"صاحب! ذرا جلدی کیجیے۔ کل کے لیے کرفیو کے اوقات لکھیں۔"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی میں کیپٹن اشفاق عرض کر رہا ہوں۔"

"کون کیپٹن اشفاق؟"

"جی میں پی آر او ہوں مارشل لاء ہیڈکوارٹر میں۔"

"اچھا آپ فون بند کریں۔ میں فون کرتا ہوں آپ کو مارشل لاء ہیڈکوارٹر میں۔"

"جی اس وقت میں مارشل لاء ہیڈکوارٹر سے نہیں بول رہا۔"

"تو صاحب مجھے کیسے یقین ہو کہ آپ صحیح آدمی صحیح جگہ سے بول رہے ہیں۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ پڑ گیا تھا آپ کے لہجے سے۔ دُوسری بات یہ کہ مارشل لاء ہیڈکوارٹر کے پی آر او کرنل عقیل ہیں، آپ کہاں سے ٹپک پڑے بیچ میں۔ شٹ اپ پٹاخ!"

فون بند۔

کرنل عقیل ہم سے پہلے مارشل لاء ہیڈکوارٹر میں تھے۔ کافی عرصے تک کراچی میں کام کرتے رہے تھے اِس لیے صحافی حلقوں میں معروف تھے۔ لیکن اب تو وہ جی۔ ایچ کیو واپس جا چکے تھے اور جانے سے پہلے وہ کسی کو بتا کر نہیں گئے تھے کہ ان کی جگہ ایک ہونہار کپتان آ رہا ہے۔

اے پی پی (ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان) کو فون کیا۔ وہاں سے بھی وہی جواب ملا۔ "بھیا، کرفیو کا معاملہ ہے۔ میں آپ کو جانتا ہوں نہ آپ کی آواز پہچانتا ہُوں۔ اِس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ واقعی کیپٹن اشفاق ہیں اور اگر ہیں تو کرفیو کے اَوقات پریس کو دینے کے مجاز ہیں یا نہیں۔ نا بھائی نا۔ ہم نہیں دے سکتے ایسے خبر۔ باقاعدہ پریس ریلیز بنوا کر بھجوائیے، مہر لگوا کر، دستخط فرما کر۔"

ہم نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے دس ہُوا چاہتے تھے۔ پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ریڈیو سے اُردو خبروں کے آخری بلیٹن میں صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ اور کراچی میں کرفیو کے اوقات کی خبر اِس میں آنا ضروری تھا۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ خبریں پنڈی سے پڑھی جاتی تھیں۔ ہم ریڈیو کراچی کو خبر دیتے، انھوں نے بذریعہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ٹیلی پرنٹر یا ٹیلیکس پنڈی بھیجا جاتی، پھر اس کا ترجمہ کیا جاتا، نیوز ڈیسک سے اس نے نیوز ریڈر تک پہنچنا تھا۔ کیا معلوم خبر تیار ہونے تک نیوز ریڈر نیوز سٹوڈیو میں داخل ہو چکا ہو یا ہو چکی ہو — خیر خبر تو ان صاحب یا صاحبہ کو خبریں پڑھنے کے دوران میں بھی دی جا سکتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ابھی تک پہلا سِرا ہی ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ کوئی صاحب ہمیں پی آر او تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ کراچی سے پنڈی تک کا فاصلہ طے ہوتا تو کیوں کر۔

عین اس وقت کوئی صاحب کار میں آئے۔ کار باہر کھڑی کر کے اندر آئے۔ معلوم ہوا کہیں فون کرنا چاہتے ہیں۔ اچانک دماغ میں آیا کہ ہمارے درد کی دوا یہی صاحب ہیں۔ تیزی سے اُٹھے، انھیں بازو سے پکڑا اور تقریباً دھکیلتے ہوئے کار کی طرف لے گئے، دروازہ کھولا، انھیں سٹیئرنگ پر بٹھایا، دُوسری طرف سے دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اس دوران ہم بڑبڑاتے ہوئے انھیں بتا چکے تھے "سخت ہنگامی حالت ہے، کئی لوگوں کی جان جانے کا خطرہ ہے۔ ریڈیو سے فوری طور پر ایک اعلان کروانا ہے، تیز چلو، تیز، جلدی۔"

ٹھیک پونے گیارہ بجے ہم ریڈیو پاکستان کے نیوز ایڈیٹر جناب زبیری صاحب سے ہمکلام تھے۔ انھیں افسری کا ثبوت شناختی کارڈ دکھایا اور خبر تھما دی۔ وہ خبر لے کر سٹوڈیوز کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ گیارہ بجے تو ہم نے ان کے کمرے میں رکھا ریڈیو آن کر دیا۔

"اب آپ ثریا شہاب سے خبریں سنیے۔"

خبریں شروع ہوئیں۔ ہمارے نزدیک اس دن کی اہم ترین خبر کراچی میں کرفیو کے اوقات تھے جس کا ابتدا میں کوئی تذکرہ نہ تھا۔ سخت مایوسی ہوئی۔ بے تابی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ بالآخر محترمہ ثریا شہاب نے پھول برسائے۔ بولیں، "کراچی میں مارشل لاء حکام نے اعلان کیا ہے کہ کل جمعہ کی نماز کے لیے کرفیو اُٹھا لیا جائے گا۔ کرفیو کے اوقات۔ . . . . . ."

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہم نے اِطمینان کا گہرا سانس لیا اور دھم سے صوفے پر گِر گئے۔ اب ہم واقعی خود کو "مارشل لاء حکام" سمجھ رہے تھے۔ ارے ہاں حکام تو جمع کا صیغہ ہے۔ ہم اکیلے تو نہیں۔ ایک اور صاحب بھی تو تھے ہمارے ساتھ۔ وہ کار والے۔" باہر آئے خبر کی طرف سے اِطمینان ہُوا تو تعارُف کا مرحلہ طے پایا۔ پتہ چلا وہ میجر ہیں۔ ہم بے چارگی سے ان کی شکل دیکھنے لگے۔ جس انداز سے ہم نے انھیں پکڑ کر کار میں دھکیلا تھا اور تحکم سے بھرپور لہجے میں جس طرح انھیں "ڈرائیور" بنا کر گاڑی تیز چلانے پر مجبور کرتے رہے تھے۔ وہ قطعاً اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ ہم تعارف کے باقی مراحل طے کریں یعنی اپنا تعارُف کراتے ہُوئے بتائیں کہ ہم ان سے کہیں زیادہ جونیئر ہیں۔ اُدھر "سر! سر! سر!" کرتے ہُوئے میجر صاحب کا مُنہ سُوکھ رہا تھا۔ "سر! کام تو ہو گیا نا۔ خیریت تو تھی نا؟ ہوا کیا سر؟"

وہ ہمارے ہاں فون کرنے آئے تھے اور ہم انھیں یہاں تک لے آئے تھے۔ اب مرتا کیا نہ کرتا ریڈیو پاکستان کی عمارت کے اندر لے گئے۔ ایک فون پر بٹھایا اور معذرت آمیز لہجے میں بولے، "مجھے اور ضروری کام بھی نبٹانے ہیں۔ آپ فون کریں، میں چلا۔" وہ کار کی آفر ہی کرتے رہے لیکن ہم زبردست شکریوں کے بعد رستہ تڑا کر بھاگ نکلے! ایک ٹیکسی پکڑی اور بندر روڈ کی ٹریفک میں گم ہو گئے۔

اسی طرح کی بدحواسیوں میں پندرہ دن گزر گئے۔ خیریت یہ گزری کہ ہر بدحواسی اچھے انجام پر ختم ہوتی تھی۔ شیکسپیئر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہُوئے لوگ کہتے ہیں — ALL IS WELL, THAT ENDS WELL "جس کا انجام اچھا ہو، وہ سب کچھ درست ہے" — لیکن ہمارے لیے تو یہ سب کچھ غلط تھا۔ ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ پیرا جمپ کورس ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ جب اس کے شروع ہونے میں صرف چار روز باقی رہ گئے تو ہم بریگیڈیئر مارشل لاء بریگیڈیئر عبدالرشید قریشی صاحب کے دفتر میں گئے۔ وہ حسبِ معمول فائلوں کے اُونچے اُونچے ڈھیروں کے جلو میں مصروفِ کار تھے۔ ہم چند ثانیے انھیں دیکھتے رہے۔ پھر عرض کیا۔ "سر! آپ سے ایک

سیمی آفیشل (SEMI OFFICIAL) نیم سرکاری) کام ہے پر آپ تو بُری طرح مصروف ہیں۔ فرصت ملے تو بلوا لیجیے گا۔"

"نیم سرکاری" کا لفظ سُن کر وُہ چونکے۔ (انھیں چونکانا ہی تو مطلوب تھا۔) بڑی شفقت سے بولے، "یہ کام تو ختم ہونے سے رہے۔ تم اپنی کہو۔"

اور ہم نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی بات کہہ دی، "سر! ہمارے ملک کے سیاستدانوں کو تہذیب، شرافت، شائستگی، تحمل اور بردباری سیکھنے کو ایک طویل عرصہ درکار ہے۔ جب تک یہ لڑتے رہیں گے، اقتدار ان سے مُنہ چھپا کر فوج کے دروازوں پر دستک دیتا ہی رہے گا۔ ملک میں مارشل لاء لگتا ہی رہے گا۔ لیکن ہمارا پیرا جمپ کورس اس بار رہ گیا تو شاید پھر کبھی نہ ہو سکے کہ چوتھی بار الاٹ ہُوا ہے۔ ہر بار فوج کو کہیں نہ کہیں ضرورت کا نزلہ ہمیں پہ گرتا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی تین بار قربان ہو چکے ہیں۔ اس بار بخش دیجیے۔"

ہماری تقریر انھوں نے تفکر آمیز مسکراہٹوں کے ساتھ سُنی۔ پھر بولے،

"تم جانتے ہو، ہمیں پی آر او کی سخت ضرورت ہے۔"

"سر! ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ آپ ہمیں ایک بار مسترد تو کریں۔"

وہ ہنس دیے اور صبح دوبارہ ملنے کو کہا۔ ہم پوری تندہی سے کام میں جت گئے۔ جانے اس دن کور ہیڈ کوارٹر اور جی ایچ کیو میں کیا گزری۔ دُوسری صبح برگیڈیر رشید نے ہمیں بلایا۔ پہلے وعدہ لیا کہ کورس ختم کر کے ہم سیدھے کراچی آئیں گے۔ پھر بتایا۔ "تمھاری درخواست منظور کر لی گئی ہے۔ دس بجے کی فلائٹ سے جی ایچ کیو سے کرنل عقیل آ رہے ہیں۔ تم جا سکتے ہو۔"

ہم نے موومنٹ آرڈر لیا، پنڈی کی سیٹ بُک کرائی۔ دوپہر سے پہلے کرنل عقیل کراچی پہنچے۔ شام سے پہلے ہم پنڈی تھے۔ دُوسرے دن ضروری کاغذات کی تکمیل کے بعد ہم عازمِ پشاور ہو گئے۔ وہاں پیرا ٹریننگ ونگ نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور پھر وہ گت بنائی کہ الاماں ـــــ اس سب کچھ کی روداد ہم

اپنی پہلی کتاب "جنٹلمین بسم اللہ" میں بیان کر چکے ہیں۔

ہم ابھی کورس ہی کر رہے تھے کہ کراچی، حیدر آباد اور لاہور سے جزوی مارشل لاء اُٹھا لیا گیا۔ ساتھ ہی جی ایچ کیو سے ہدایت آئی کہ کورس ختم کرنے کے بعد واپس استور سدھارو۔ کوئی ضرورت نہیں کراچی جانے کی۔ مارشل لاء اٹھنے پر تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا لیکن یہ دوبارہ پہاڑوں پر چڑھنے کے احکامات ملے جلے ردِ عمل کے ساتھ وصول کیے۔

پیرا جمپ کورس ختم ہُوا۔ ہم نے وردی پر ایک خوبصورت ونگ کا اضافہ کیا۔ کچھ دن چھٹیوں میں گزارے۔ پی آئی اے سے گلگت کی ٹکٹ کٹوائی اور پنڈی کی سڑکیں ماپنے لگے۔ گلگت تک کی پرواز کا حال ہم بیان کر آتے ہیں کہ جہاز کیسے سوسو نخروں کے بعد اڑتا ہے، اُڑتا ہے تو ڈولتا ہے، ڈولتا ہے تو موسم کی شکایت کرتے ہوئے واپس لوٹ آتا ہے اور مسافروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ سیٹ بیلٹ باندھ لیں، سگریٹ بجھا دیں کیونکہ جہاز تھوڑی دیر بعد چکلالہ کے ہوائی اڈے پر اُترنے والا ہے۔

جب تک ہمیں سیٹ ملی اور جہاز ہمیں لے کر گلگت پہنچا۔ ملکی حالات میں پھر تبدیلی آ گئی۔ ملک میں مارشل لاء نافذ ہُوا۔ اقتدار فوج نے سنبھالا اور سیاستدانوں کو حفاظت میں لے کر ایک صحت افزا مقام پر رکھ دیا گیا۔ ادھر ہم استور پہنچے۔ ادھر ملٹری سیکرٹری برانچ سے ایک سگنل کہ ہمیں مستقل طور پر کراچی بھجوا دیا جائے۔ دو تین روز کی الوداعی پارٹیوں کے بعد رختِ سفر باندھے ہم پھر پا بہ رکاب تھے۔

گلگت سے پنڈی پرواز کے دوران میں ہم نے نانگا پربت کے محوِ خواب حُسن SLEEPING BEAUTY کو خدا حافظ کہا اور جاگتے حسن کے شہر میں قیام کے منصوبے باندھنے لگے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

جھروکۂ مارشل لاء سے

کراچی ـــــــ جگمگاتی روشنیوں کا شہر، جس کے اندھیروں میں درد کلبلاتے ہیں پاکستان کا امیر ترین شہر، جہاں ملک کے سب سے زیادہ غریب بستے ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کی آماجگاہ جہاں لوگ جھونپڑیوں میں مقیم ہیں۔ وسیع ترین شہر جہاں لوگ کبوتروں کے کابک نما فلیٹوں میں رہتے ہیں۔ مصروفیت کا عالم اور ہنگامے کا سماں۔

راولپنڈی کے صحافی سعود ساحر کا کہنا ہے کہ کراچی کی ہر تیسری سڑک کا نام نواب صدیق علی خان روڈ ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دفعہ وہ کراچی گئے۔ ناظم آباد میں نواب صدیق علی خان روڈ سے ملحق کسی روڈ پر ایک رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے۔ کراچی کی وسعتوں میں تو بڑے پرانے کھلاڑی گُم ہو جاتے ہیں، سعود ساحر تو پہلی مرتبہ گئے تھے کسی تقریب کے اختتام پر کوئی صاحب انھیں کار میں ان کی رہائش گاہ پر چھوڑ گئے یہ کار سے نکل کر دعا سلام کے بعد جو چلے تو چکرا گئے، دائیں بائیں کی گلیوں میں گھر تلاش کیا، بے سود، ایک بڑی سی سڑک پر آ نکلے کسی سے پوچھا

"یہ کون سی سڑک ہے"؟

"نواب صدیق علی خان روڈ"

ٹھیک یہاں سے دائیں جانا تھا مجھے، پھر دائیں اور غالباً پھر بائیں۔ سعود ساحر ایک چھوٹی سی سڑک پر اتر گئے پھرتے پھراتے ایک وسیع شاہراہ پر آ نکلے۔ کسی سے پوچھا "یہ کون سی سڑک ہے بھائی"؟

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"نواب صدیق علی خان روڈ"

"اچھا یہ بھی نواب صدیق علی خان روڈ ہے چلو اس دفعہ بائیں چلتے ہیں"

وہ پھر ایک ذیلی سڑک پر اتر گئے ـــــــ لیکن پندرہ بیس منٹ میں پھر خود کو ایک بڑی سڑک پر پایا اور پوچھنے پر پھر یہی جواب ملا۔

"نواب صدیق علی خان روڈ"

وہ تو بھلا ہوا کہ جن کے ہاں ٹھہرے تھے انھوں نے کار سے اترتے دیکھ لیا تھا جب کافی دیر تک نہ پہنچے تو وہ خود نیچے آئے انھیں تلاشا اور بولے

"بھائی جان! کھڑکی سے آپ کو آتا دیکھ کر ہم نے کھانا لگوا لیا تھا لیکن اتنی دیر سے آپ کو دیکھ رہے ہیں، آپ اِدھر سے نکلتے ہیں اُدھر چلے جاتے ہیں، اُدھر سے نکلتے ہیں اِدھر کی سڑک پہ اُتر جاتے ہیں، خیریت تو ہے نا کچھ کھو تو نہیں گیا؟"

ایک اور صحافی ہیں ہارون رشید ـــــــ ان کی رائے میں "شہر کیا ہے بسوں کا اڈہ ہے"، جیسے بسوں کے اڈے پر ایک افراتفری سی مچی رہتی ہے۔ شور و شغب برپا رہتا ہے کنڈکٹروں کی ایک کھیپ ہر شخص کو اپنے مطلب کی منزل کی طرف لے جانے پر تُلی رہتی ہے اور جیسے ہر مسافر بسوں کے اڈے پر بوکھلا سا جاتا ہے اسی طرح کا حال کراچی میں انسان کا ہوتا ہے۔ کچھ تو لوگوں کے ذاتی مسائل، کچھ منصوبہ بندی کا فقدان سونے پر سہاگہ، صبح اٹھو تو انسانوں کا ایک سیلاب چاروں طرف سے صدر کے مرکزی علاقوں کی طرف بہہ رہا ہوتا ہے۔ کہ بیشتر اہم کمرشل کمپنیوں، فرموں، بنکوں اور اخباروں کے دفتر یہیں واقع ہیں۔ تجارتی کاروبار بھی انھی علاقوں میں مرتکز ہیں۔ قانون کے ادارے یعنی سندھ اسمبلی بلڈنگ، ہائیکورٹ، ضلع کچہری اور وکلاء کے دفاتر بھی یہیں ہیں صوبائی سیکرٹریٹ، ایم پی اے ہوسٹل، کوسٹل گارڈز، پولیس ہیڈ کوارٹرز۔ ریڈیو پاکستان، میڈیکل، انجینئرنگ اور سائنس کالج غرض کسی بھی ادارے کا نام لیں کم و بیش صدر یا اس سے ملحقہ علاقے ہی میں ملے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ صبح کے وقت ٹریفک کا سارا بہاؤ

صدر کی طرف ہوتا ہے۔ بے شمار انسان خس و خاشاک کی طرح بہے چلے آتے ہیں۔ بسیں کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں اور بس سٹاپوں پر بے چارگی کی تصویر بنی بے یار و مددگار سواریوں کا ہجوم جن میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت خواتین ورکر اور طالبات کی ہوتی ہے اس دوران میں صدر سے باہر جانے والی سڑکیں خالی خالی رہتی ہیں

دوپہر کے بعد پورا عمل الٹ جاتا ہے۔ یعنی صدر سے باہر جانے والی سڑکوں کی شامت آجاتی ہے۔ بسیں رات گئے تک سواریاں ڈھوتی رہتی ہیں۔ اس سب کچھ پر مستزاد یہ کہ نئے نئے دفاتر، تجارتی مراکز اور شاپنگ سنٹروں کی تعمیر کا ندرہبی اسی علاقے کی طرف ہے، الاماں۔

ہم دوبارہ اس شہر میں آئے تو شروع شروع میں عجب حالت رہی۔ موٹر سائیکل پر دفتر سے نکلتے تو میس بھول جاتے، میس سے نکلتے تو دفتر کی راہ نہ پاتے۔ حفظ ما تقدم کے طور پر ٹنکی ہمیشہ فُل رکھتے۔ وہ تو خیر گذری کہ تین چار دن بعد ہی ہمیں مارشل لاء ہیڈ کوارٹر میں منتقل کر دیا گیا۔ رہنے کو ایم پی اے ہوسٹل میں جگہ ملی جو سندھ اسمبلی بلڈنگ کے سامنے ہی ہے اس طرح ہم باقاعدہ "مارشل لاء حکام" میں شامل ہو گئے۔

مارشل لاء ہیڈ کوارٹر میں کچھ دن بیٹھنے سے پتہ چلا کہ عوام اسے ہر مرض کی دوا سمجھتے ہیں۔ عوام یہاں سیاسی معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا زن، زر اور زمین تو خیر بہت پہلے سے جھگڑوں کی بنیاد ہیں اور یہ جھگڑے پیچیدہ بھی ہوتے ہیں لیکن چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کے لیے بھی مارشل لاء سے رجوع کیا جاتا ہے۔ کسی کو پڑوسی کی مرغیوں سے شکایت ہے۔ درخواست بنام مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بعنوان خطرہ برائے صحت عامہ ——— کسی صاحب نے گاڑی ٹھیک ہونے کو دی، مستری نے دیر کر دی۔ دہائی ہے مارشل لاء حکام کی۔ میاں بیوی کا جھگڑا ہوا مارشل لاء سے مداخلت کی اپیل۔ آجر و مزدور میں ٹھن گئی کیس مارشل لاء میں دینے کی دھمکی۔ بہو ساس کے ہاتھوں تنگ آگئی مارشل لاء سے "انصاف" کی التجا۔ قطع نظر اس کے کہ ہم اس پر ایکشن لینے کے مجاز تھے یا نہیں ہر طرح کی درخواستیں تھیں جو شترِ بے مہار کی طرح منہ اٹھائے چلی آتی تھیں۔

اور تو اور ایک بار طوائفوں کی طرف سے ایک درخواست وصول ہوئی جس میں ایک خاص علاقے کے حوالے سے کہا گیا تھا کہ وہاں طوائفوں کا کاروبار یومِ ازل سے جاری رہا ہے ۱۹۷۱ء میں مغربی پاکستان انسداد جسم فروشی ایکٹ کے تحت گرچہ عارضی طور پر پابندی لگی تھی لیکن بہر حال طوائفوں پر رزق کے دروازے کھلے رکھے گئے تھے اور رقص و سرود پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ناچ گانے کا سلسلہ موجودہ مارشل لاء کے نفاذ تک بھی جاری رہا۔ لیکن مارشل لاء کے مقامی حکام نے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا تھا درخواست کے مطابق کئی عورتیں تھیں جن کے چھوٹے چھوٹے بچے تو تھے لیکن نامعلوم باپوں کی شفقتوں سے محروم وہ بھوک سے بلک رہے تھے۔ بخار میں سلگ رہے تھے۔ طوائفوں نے درخواست کی تھی کہ یا تو انھیں کاروبار جاری رکھنے کی اجازت دی جائے یا پھر شرقِ اوسط کے ممالک کو برآمد کر دیا جائے جہاں بقول ان کے ان کی بڑی مانگ تھی اچھا خاصا زرمبادلہ کما کر پاکستان بھیجنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آئی کہ اس درخواست کا کیا کرتے چنانچہ داخلِ دفتر کر دی آپ ہماری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

بجا! لیکن اس کا اپنا وجود؟

خود ایک لڑکی کی زبانی سنیے، موتی جیسے لفظوں کی تحریر میں شستہ انگریزی میں موصول ہوئی۔ ترجمہ:۔

"میں ——— میں ایک ناآسودہ لڑکی ہوں عمر اٹھائیس سال، کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کی ہے، ہنگاموں کے اس بھرے پُرے شہر میں قابلِ عزت مقام پر فائز ہوں اپنا کام دیانتداری اور تندہی سے کرتی ہوں۔ ایک باپ کا سہارا تھا وہ حال ہی میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے سمجھدار آدمی تھے، خاندانی روایات کے خلاف انھوں نے سوچا۔ بیٹی کے مستقبل کو غربت کی پرچھائیوں سے بچانے کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ انھوں نے تعلیم دلوائی یونیورسٹی کے دنوں میں سوچا کرتی تھی لڑکیوں کا کام جب بھاڑ جھونکنا ہی ٹھہرا تو یہ تعلیم کیوں لیے دم چلے گئے ہیں میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں اب خیال آتا ہے ان کی سوچ کتنی درست تھی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لیکن یہ رشتہ دار، جتنے منہ اتنی باتیں، یہ کبھی کسی کو سُکھی نہیں دیکھ سکتے۔ کہتے ہیں میں ذہین نہیں ہوں صرف خوبصورت ہوں اور خوبصورتی ہر چیز حاصل کرسکتی ہے یہ باتیں تیر کی طرح میرے دل میں اترتی ہیں۔ کڑھتی ہوں لیکن جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔

سنتے ہیں شوہر سرتاج ہوا کرتا ہے اور بیوی اس کی رعایا، آقا مشفق ہو تو رعایا خوش رہتی ہے۔ ظِلِّ الٰہی کے ناز سہنا کتنی حسین بات ہے لیکن میری زندگی؟ جہاں تلک دیکھتی ہوں اندھیروں کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا، چڑھتی جوانی کا روپ ہم پر بھی تھا اور ہے لیکن گہنا چلا ہے۔ ہمدرد ملتے ہیں لیکن خول اترتے ہیں تو پتہ چلتا ہے رہبروں کے روپ میں راہزن تھے۔ ناخدا ملتے ہیں لیکن مسکراتی منزلوں کی طرف لے جانے کی بجائے ویران جزیروں پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

شکاری کُتّے! مجھ ایسی سینکڑوں لڑکیاں ان کی ہوس آلود نگاہوں سے خود کو چھپائے پھرتی ہیں اور یہ کمبخت ـــــــ جسموں کی مہکاریں سونگھتے پھرتے ہیں، سلگتی روحوں کی اداسیوں کی انھیں کیا خبر؟ مسکراہٹوں کا خریدار ہر کوئی نظر آتا ہے بے چینیوں کا مداوا کوئی نہیں بنتا۔

اُف وہ لڑکیاں جن کا شباب ڈھل رہا ہے، روپ جل رہا ہے اور جو اپنی گزرتی جوانی کو حسرت بھری نظروں سے تک رہی ہیں وہ زندہ ہیں ـــــــ پر اس جینے پر شرمندہ ہیں۔ میں بھی انھی میں سے ایک ہوں ہم میں سے بہت سی لڑکیاں برسوں اپنی عفت کو بچاتی رہی ہیں لیکن فطرت؟ جبلّت؟

فطرت سے لڑنا بڑے لوگوں کا کام ہے ـــــــ وہ جن کی کچھ قدریں نہیں ہوتیں جو خود پر قابو نہ پاسکیں، جنھیں کسی کی دوستی میسر آئے نہ دم بھر کی رفاقت، اپنے خانساموں، ڈرائیوروں اور ملازموں سے ہی فلرٹ کرنے لگتی ہیں کیا کریں؟ دریا نشیب کی طرف بہتا ہے اسے بہنا ہے راستہ جیسا بھی ملے۔

شادی ـــــــ؟ شادی کروانے والے درجنوں ادارے اس ملک میں موجود ہیں لیکن کوئی سے جوان سے پوچھے انھوں نے کتنے دل ملوائے؟ کتنے رشتے جڑوائے؟

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

Father passed away in the near past. He was a religious man. So he thought, my education as a protection from poverty on my behalf. It was right.

Now my own relatives blame me. They say that I got the job by mean way. My qualification is also at stake. I never care for these ill minded personals.

You know husband is the crown and woman is a state. Cold minded as far as I think, nothing but darkness shadows the happy path of my life. I am no more charming as I was in my early days of youth. Hundreds girls like me are seeking for sheltering themselves from the eyes of the Bulldogs around our poor soules and itching bones.

If we shall not get suitable mates, the future coming famine gender will think higher education merely as a wastage of time, and corruption will make its way deep into the academic field. The crop will destroy even the field.

As the wisdom of a soldier and a slave render in his neck, so I am going to give you the following hints to solve the problem.

(اصل خط کے ایک صفحہ کا عکس)

کتنی لڑکیوں کو سہاگن بنایا ؟ کتنی بھٹکتی روحوں کو سکون آشنا کیا ؟

کہتے ہیں سہاگن وہی جسے پیا چاہے۔ ہزاروں لڑکے ہزاروں لڑکیاں ایسی ملیں گی جنھیں جہیز کی تمنا ہے نہ دولت کی چاہت، رسموں سے بیزار، بے چین لوگ صرف ایک سہارے کے متلاشی ہیں وہ ایک سہارا جسے زندگی کا کنارہ کہا جا سکے لیکن یہ سرپرست کہ اپنا کہیں جسے صرف سوشل معیار دیکھ کر رشتے مقرر کرتے ہیں۔ ہمارے سرپرستوں کو صرف ڈاکٹروں اور انجینئروں کی تلاش ہوتی ہے۔ کبھی جگمگاتے پھولوں سے مزین شانوں والے بھی لڑکیوں کے آئیڈیل ہوا کرتے ہیں اور اب بھی سمارٹ ہونے کی وجہ سے دل موہ لیتے ہیں لیکن باقی کنواروں کو گنوار سمجھا جاتا ہے۔ خدا خدا کرکے دو خاندانوں کی ملاقات ہو بھی جائے تو فریقین کے سرپرست مطالبات کی فہرستوں کا تبادلہ کرتے ہیں اور طلوع ہوتی ہوئی صبحیں بھی تاریک راتوں میں بدل جاتی ہیں۔ جگمگاہٹوں کی تمنا کتنی معصوم سی خواہش ہے لیکن اس کا حصول کتنا کٹھن ہے ؂

کتنی ذرا سی بات تھی اک خواہشِ سکوں
افسانہ بن گئی ہے اک تعمیرِ آشیاں

اس طرح آنے والی نسلوں کے لیے بہترین مائیں بننے کی بجائے ہمارے ضمیر اور فطرت کے تقاضے ایک دوسرے سے الجھ جاتے ہیں۔ اس کشمکش سے تنگ آکر ہم میں سے بہت سی لڑکیاں اپنی روزمرہ کی عادات میں چڑچڑی ہو جاتی ہیں، غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے۔ راتیں بے چین ہو جاتی ہیں۔ اور سکون سے محروم ہو کر ہم اندھیروں میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔

اگر آج ہمیں ہمارے مناسب شریکِ حیات نہ مل سکے تو آنے والی صنفِ نازک کی نسلیں اعلیٰ تعلیم کو وقت کا ضیاع سمجھیں گی۔ بددیانتی، خیانت اور مجرمانہ ذہنیت تعلیمی میدان میں در آئے گی۔ اور پھر جو فصل ابھرے گی وہ کھیت کو بھی اجاڑ کر رکھ دے گی۔

میں مندرجہ ذیل تجاویز اس ملک کے حکام کو پیش کرتی ہوں

۱۔ ایک حکم کے ذریعے شادی کرانے والے تمام اداروں کو سربمہر کر دیا جائے

۲۔ ان اداروں میں موجود تمام ریکارڈ قبضے میں لے لیا جائے۔

۳۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی فہرستیں تیار کی جائیں ان کے مناسب جوڑے بنائے جائیں اور پھر ایک حکمنامے کے ذریعے ان تمام کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائے۔

یہ وقت کا اہم تقاضا ہے قرار دادوں اور جہیز کم کرنے کے ملبوں نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ معاملے کو اور الجھا دیا ہے اب فریقین خفیہ معاہدے کرتے ہیں۔ میری رائے میں اس شہر کے رہنے والوں کے آباؤ اجداد میں کوئی نہ کوئی یقیناً بنی اسرائیل سے تھا۔ یہ کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے، قانون کو اپنی تمناؤں کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔

میں ایک وفادار پاکستانی ہوں۔ خدا اور اس کے رسول کے بعد وطن سے محبت میرا ایمان ہے۔ جو کچھ خلوص سے محسوس کیا ہے کہہ دیا ہے۔ اس آتش فشاں شہر کے نیچے جو کچھ میں دیکھ رہی کاش دوسروں کو بھی نظر آئے۔ خدارا ہمیں چار دیواری دو، چادر دو۔

دی گئی تجاویز قابلِ عمل ہیں یا نہیں، ہم نے من و عن ترجمہ کر دیا ہے سوچنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ! یہ ایک لڑکی کا نہیں، ہزاروں لڑکیوں کا ترجمان خط ہے۔ ؂

بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

کبھی آپ نے غور کیا پاکستان کے مغرب میں بے پناہ دولت ہے اور مشرق میں بے پناہ حسن۔ جوں سمتیں بدلتی ہیں دونوں سکڑنے لگتے ہیں کراچی مایا کا شہر ہے پاکستان کی سب سے زیادہ دولت یہیں گردش کرتی ہے آپ یہاں سے مشرق کی طرف چلیں دولت میں کمی آتی جاتی ہے پنجاب اور سرحد کے شہروں سے گذر کر قراقرم اور ہمالیہ کے سلسلوں تک پہنچتے پہنچتے سکوں کی جھنکار بہت مدھم پڑ جاتی ہے۔ وہاں بستے جھرنوں کا ترنم ہے حسین وادیوں کی گنگناہٹ ہے، رنگ برنگے پھولوں کی مسکراہٹ ہے، سرگوشیاں کرتے چناروں کی سرسراہٹ، سبزہ زاروں کی ملائمت اور معصوم حسن کی فراوانی، امن، سکون ——— پہاڑوں سے اترنا شروع ہوں تو معصومیت سمٹنے لگتی ہے۔ تصنع بکھرنے لگتا ہے، سرحد اور پنجاب سے گذرتے گذرتے آپ کراچی پہنچیں تو یوں لگتا ہے انسان عنقا ہو گیا ہو۔ ہر آدمی نے چہرے پر خول چڑھا رکھا ہو۔ جھوٹ کا فریب،

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

سرخی کا، غازے کا ـــــــــ شرافت کے پیکر ہر جگہ پائے جاتے ہیں کہ جو مقام ان کے وجود سے خالی ہوں، باقی نہیں رہتے لیکن یہاں مایا کے پجاری زیادہ ہیں ؎

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
دھن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

لیکن دھن کے پجاری پھر بھی اسے میت رکھتے ہیں چاہے اس کے لیے من بکے یا تن۔ من کے رشتوں میں ایک خوشبو ہوتی ہے جو قربتوں کی ملائمت سے اور مہکتی ہے دھن کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا تبھی تو دھن کے پجاریوں کو قربتوں کی لذتیں نصیب نہیں ہوتیں۔ وہ ہر ایک سے بے گانہ ہو کر خود اپنوں سے نظریں چراتے پھرتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک ایئرہوسٹس ہمارے پاس آئی۔ مسکراہٹوں کی تمام تر بجلیاں گرانے کے بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ ہم "زیر" ہو چکے ہیں تو گویا ہوئی کہ ایک عدد نئی چمکتی دمکتی کار ہے جو ہے تو اس کی لیکن اس کے قبضے میں نہیں کیا ہی اچھا ہو اگر وہ کار انھیں دلوادی جائے۔

"کس کے قبضے میں ہے؟" ہم نے دریافت کیا۔

"مسٹر...... کے قبضے میں"۔

"ان کے قبضے میں کیسے چلی گئی"؟

"جی میں نے ہی بھجوائی تھی، باہر سے، اپنی جمع پونجی خرچ کر کے، کسی کے نام تو بھیجنا تھی۔ سو ان کے نام بھجوادی یہ سوچ کر کہ پاکستان واپس جاؤں گی، تو لے لوں گی لیکن اب ان صاحب کی نیت بدل گئی ہے"۔

"کون ہیں یہ صاحب؟ کب سے واقفیت ہے آپ کی ان سے؟"

"جی ہیں تو میرے فادر ہی!!!"۔

ہم ان محترمہ کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

ایک شام کو آفس کا کام ختم کر کے تھکے ہارے ایم پی اے ہوسٹل پہنچے نہا دھو کر باتھ روم سے نکلے تو اردلی نے بتایا کہ ایک وفد ہم سے ملاقات کا متمنی ہے لباس بدل کر ہم

نشست گاہ میں آئے، علیک سلیک کے بعد

"جی فرمائیے؟"

"سر، بے وقت زحمت دینے پر معذرت خواہ ہیں لیکن ذہنی الجھنوں کے مداوے صرف آپ کے پاس ہیں"۔ ایک نوجوان ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا

"جی فرمائیے میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟"

"سر! میری خون پسینے کی کمائی داؤں پر لگی ہے ایک لڑکی ہے جو اسے اچک لے جانے پر تلی ہوئی ہے"۔

"تفصیل سے بتائیں ذرا"۔

"میں نے محنت سے پیسے جمع کیے اور انگلینڈ میں ایک لڑکی کو بھجوائے کہ ان پیسوں سے مجھے ایک کار بھجوادے، کم پڑیں تو اپنے پاس سے ڈال دے میں یہاں اُسے دے دوں گا۔ اس نے پیسے وصول کر لیے، کار بھی بھجوادی لیکن اب مُکر گئی ہے اور کار پر ملکیت کا دعوٰی کرتی ہے"۔

"کون ہے یہ لڑکی؟ تم اسے کیسے جانتے ہو، اعتماد ہوا کیونکر کہ ہزاروں روپے آنکھیں بند کر کے بھجوا دیے اور اب ان الجھنوں کی نوبت کیوں کر آئی"؟

"کہنے کو تو بہن ہے جی میری ..... ایئرلائن میں کام کرتی ہے"۔

ہمیں پھر سکتہ ہو گیا۔

دوسرے دن ہم نے کار پر "قابض" صاحب کو بلوایا وہ ایئرہوسٹس اور ان کے بھائی کے والد گرامی تھے۔ ان سے اصل صورت حال دریافت کی معلوم ہوا بیٹی کو ایک غیر ملکی ایئرلائن کی نوکری دلوانے میں وہ خود ہزاروں روپے کے مقروض ہو گئے۔ بیٹی برسرِ روزگار ہوئی تو خیال تھا نہ صرف قرض اُتر جائے گا بلکہ گھر میں بھی آسودگی کا دور دورہ ہو گا۔ لیکن دولت کی محبت جی کا جنجال بن گئی۔ بیٹی شروع شروع میں تو ٹھیک رہی پھر اسے گھر کا ماحول دقیانوسی لگنے لگا۔ جب تک باہر رہی پاکستان کا چکر

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لگتا تو گھبرا جاتی، پوسٹنگ کراچی ہوئی تو الگ فلیٹ لے کر تنہا رہنے لگی۔ آنے سے پہلے اس نے ایک کار بھجوائی تھی جس کا کسٹم اس کے بھائی نے ادا کیا اور گاڑی چھڑوائی خریدنے کے لیے بھی کچھ رقم اس نے بھجوائی تھی۔ اب بیٹا کہتا ہے کہ کسٹم اصل قیمت سے کہیں زائد ادا کیا گیا ہے۔ کار اس کی ہے، بیٹی کا کہنا ہے کہ وہ برسوں سے گھر پیسے بھیجتی رہی ہے۔ انھی پیسوں سے بھائی نے بزنس شروع کیا تھا کسٹم ادا کر کے اس نے کوئی احسان نہیں کیا گاڑی اس کی ہے۔

"آپ کسے گاڑی دینا چاہیں گے؟"

"جی کسی کو بھی نہیں، خواہ مخواہ وجہ نزاع بنی رہے گی۔ اسے میرے پاس ہی رہنے دیں"۔ والد صاحب نے فرمایا۔

"اقتدار" میں رہتے ہوئے بے اختیار ہونے کے درد کی خلش بڑی جانگسل ہے، جانکاہ ہے، ہمارا قانون قدم قدم پر انصاف کی راہ میں رکاوٹ ہے یہ عدالتوں کے ہاتھ بھی باندھتا ہے، حکمرانوں کے بھی۔ مجرم دندناتے پھرتے ہیں۔

ایک صاحب ہمارے پاس آئے، ہندوستان کے شہری تھے۔ ان کی شادی ہوئے دو ماہ ہوئے تھے۔ کہ ان کی دلہن پاکستان آئی حسین تھی، جوان بھی، شباب کا رنگ، مہندیوں کی خوشبو، ایک صاحب مر مٹے اور دولت کے جال بچھا کر اسے قید کر لیا اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ دولہا میاں پاکستان آئے اور دلہن کو واپس چلنے کو کہا وہ نئے راستوں پر گامزن تھی۔ صاف انکار کر دیا، الٹا طلاق کا مطالبہ کیا اب یہ صاحب دلہن کے بھارتی شہری ہونے کے ثبوت اٹھائے پھرتے تھے۔ اپنے بیٹے کی واپسی کا مطالبہ کرتے تھے۔ لیکن کوئی شنوائی نہ تھی ان کا ویزا ختم ہونے میں دس دن باقی تھے مارشل لاء کے ضابطوں کے تحت ہم اس کیس میں کچھ نہ کر سکتے تھے بلکہ مروجہ قانونی نظام کے حوالے کرنے کے پابند تھے ایک جج صاحب بیٹھے تھے ان سے مشورہ کیا۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

"معاملہ تو بالکل سیدھا سادھا ہے قانونی پوزیشن یہ ہے کہ دلہن پاکستان کی شہری ہی نہیں۔ اس کا قیام ہی غیر قانونی ہے آپ احکامات جاری کر سکتے ہیں فوری طور پر اسے واپس بھجوانے کے"۔

جج صاحب ہنسے اور بولے

"بڑے بھولے ہیں آپ، اگر گواہیاں وقت پر ملتی رہیں اور مجسٹریٹ خود بھی ایسے مقدمے جلدی نپٹانا چاہے تب بھی چھ ماہ تو لگیں گے کم از کم"

وہ صاحب روتے ہچکیاں بھرتے واپس چلے گئے۔

ہم "مارشل لاء حکام" میں شامل ہوئے تو جب تک قانون سے "نا آشنا" رہے لوگوں کا کوئی نہ کوئی مسئلہ حل ہوتا ہی رہا ہمارے ہاتھوں۔ جب ہم بھی "قانون آشنا" ہو گئے تو ہمارا کام بس ڈاکیے جتنا رہ گیا اِدھر کی فائل اُدھر، اُدھر کی فائل اِدھر۔

شروع شروع کی بات ہے سارے دن کی مصروفیت کے بعد رات کے دس بجے دفتر سے اٹھا ہی چاہتے تھے کہ ایک پٹھان آیا اور کچھ "عرض" کرنے کی درخواست کی سارے دن کے کام سے تھک کر چور ہو چکے تھے۔ اسے کہا کہ صبح آ جانا وہ روتے ہوئے قدموں میں جھک گیا۔ کہ ابھی سن لیں میری فریاد ــــــ ہم پھر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوا کسی نے بیرون ملک بھجوانے کا جھانسہ دے کر اس کے گاؤں کے چھ آدمیوں سے چھیانوے ہزار روپے ہتھیا لیے۔ اب ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ اس سے پہلے بھی ایسی کئی شکایتیں آئی تھیں، مارشل لاء کی طرف سے بھرپور کارروائی کے نتیجے میں کئی لوگوں کی رقمیں واپس مل گئی تھیں۔ جس کے بعد تمام جعلی ٹریولنگ ایجنٹ زیر زمین چلے گئے تھے۔ ہاتھ ہی نہ آتے تھے۔ ہم نے درخواست گذار کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہچکیاں لیتے ہوئے مُصر رہا کہ ہمارے قلم کی ایک زد سے اسے انصاف مل جائے گا۔ کچھ کریں ــــ ایک تو سارے دن کی تھکن دوسرے یہ یقین کہ ملزم ہاتھ کہاں آئے گا۔ درخواست کنندہ کی تسلی کے لیے ہم نے ایک چٹ پھاڑی۔ ملزم کا نام پتہ لکھا اور متعلقہ تھانے کو ہدایت کر دی کہ اسے گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ پٹھان دعائیں دیتا

رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن دفتری اوقات کے ابتدا ہی میں ایک تھانیدار صاحب آئے، اور "عرض" کی کہ آپ کے حکم کے مطابق فلاں صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ملزم پابجولاں حاضر ہے۔ ہم گھبرا گئے۔ صوبے میں کسی کو گرفتار کرنے کا مجاز یا تو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا نمائندہ صوبائی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہے یا کوئی فوجی عدالت جو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے حکم ہی سے تشکیل پاتی ہے۔ وہ سینئر افسر بھی کسی کو گرفتاری کے احکامات جاری کر سکتے ہیں جنھیں صوبائی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے بطور خاص یہ اختیار دے رکھا ہو لیکن ہم تو سٹاف افسر تھے۔ تین میں نہ تیرہ میں۔ درخواست گذار کا دل رکھنے کو ایک سادہ سی چٹ پر دو سطریں گھسیٹ دی تھیں۔ یہ سوچ کر کہاں ہاتھ آئے گا ملزم۔ لیکن غالباً اس کے تعلقات علاقے کے تھانیدار سے اچھے نہیں تھے۔ لیکن اب ہم کیا کرتے۔ سوچا اسے ڈرا دھمکا کر کام نکلتے ہیں۔ لیکن وہ ایک ہی کائیاں نکلا، بلوا کر پوچھا۔

"تم نے پیسے لیے تھے اس سے"؟

"کس سے جی ——"؟

"یہ جو تمھارے سامنے کھڑا ہے!" ہم نے درخواست کنندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے، میں تو جانتا تک نہیں اسے"۔

لو کر لو انصاف، ہم نے بے بسی سے الزام تراش کی طرف دیکھا جو مسلسل رو ئے جا رہا تھا۔ خدا رسولؐ کی قسمیں دے دے کر کہہ رہا تھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن مخالف فریق چٹان کی طرح ساکت وصامت کھڑا تھا گویا زبانِ حال سے پکار رہا ہو

"پہلے ثابت تو کر دیں مجرم ہوں، پھر کر لو جو کرنا ہے"۔

ہم نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے دونوں پر جرح شروع کی۔ اور روشنی کی ایک لکیر ہاتھ آگئی۔ معلوم ہوا کہ درخواست کنندہ نے جب پیسے دیے تھے تو ملزم باہر

بھجوانے کا لالچ دے کر انھیں انگلیوں پر نچاتا رہا۔ یہاں تک کہ گھر کے کام بھی لیتا رہا۔ جھاڑنا پونچھنا، برتن مانجنا، سودا سلف منگوانا، بچوں کو بہلانا —— بڑا سادہ سا نقطہ ہاتھ آگیا تھا۔ ملزم سے کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ لے کہ وہ جو بیان دے رہا ہے درست ہے اس نے ڈٹ کر کہا

"سو فیصد"۔

ہم نے معاون دفتر کو بلوایا اور گاڑی منگوائی فریقین کو بتایا کہ ہم ملزم کی رہائش گاہ کی طرف چل رہے ہیں۔ درخواست کنندہ بچوں کو بلائے گا بچوں کے رویے ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ درخواست کنندہ کو جانتے ہیں یا نہیں اگر وہ درخواست کنندہ سے مانوس پائے گئے تو ملزم، پکا مجرم وگرنہ درخواست کنندہ جھوٹا، مقدمہ خارج ——

بعد میں معلوم ہوا کہ ملزم نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اپنے پڑوسیوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر کوئی پوچھنے آئے تو خبردار جو کسی نے درخواست کنندہ کو پہچانا یا کوئی ایسا بیان دیا جس سے اس کا اس کے گھر میں آنا جانا ثابت ہو لیکن اپنے معصوم بچوں کی طرف اس کا دھیان ہی نہ گیا تھا۔

بچے درخواست کنندہ سے نہ صرف مانوس تھے بلکہ انکل انکل کہہ کر اس سے لپٹے جاتے تھے۔ درخواست کنندہ انھیں سینے سے لگائے آنسوؤں کے دریا بہا رہا تھا ہم واپس دفتر آئے ملزم کو بلایا اور بچوں کے درخواست کنندہ سے مانوس ہونے کی وجہ پوچھی بولا

"میری بیوی نے اسے دو چار دنوں کے لیے ملازم رکھا تھا لیکن بددیانتی کی وجہ سے نکال دیا"۔

"تم کہہ چکے ہو کہ تم نے اس سے پہلے اسے دیکھا تک نہیں"۔

"ہاں! میری ملاقات اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی میں گھر میں بہت کم رہتا ہوں، صبح سویرے نکل جاتا ہوں، رات گئے لوٹتا ہوں گھر کے ملازم بیوی ہی رکھتی ہے اسی سے آج معلوم ہوا کہ یہ ہمارا ملازم رہا ہے، لیکن اب بلیک میل کرنے پر اُترا ہوا ہے"۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہمیں یقین ہوگیا کہ ملزم نہ صرف مجرم ہے بلکہ انتہائی عیار بھی۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود قانونی سقم یہ تھا کہ ایک تو اسے مجرم ثابت کرنا ہمارا کام تھا یا درخواست گذار کا دوسرے ہم عدالت تھے نہ اسے گرفتار کرنے کے مجاز۔ مارشل لاء کے قانونی مشیر ڈپٹی اسسٹنٹ جج ایڈووکیٹ جنرل (DAJAG) سے انٹرکام پر بات کی انھیں بتایا کہ ایک مجرم "غلطی" سے ہمارے ہاتھوں گرفتار ہوگیا ہے اس عمل کو قانونی تحفظ دینے REGULARISATIONS کی کوئی راہ بتائیں۔ وہ الٹا ہم پر برس پڑے

"یہ کیا حرکت کی ہے تم نے۔ کیا اتھارٹی ہے تمھارے پاس کسی کو گرفتار کرنے کی تمھیں جراءت کیسے ہوئی اس کی۔ قانون کو کھیل بنا لیا ہے مارشل لاء کو بدنام کر دو گے۔ چھوڑ دو اسے فوراً۔ بھیجو شکایت کنندہ کو سول عدالت میں"۔

"سر! مجرم واقعی مجرم ہے۔ ہمیں یقین ہے"۔

"کیا ثبوت ہے تمھارے پاس اس کے مجرم ہونے کا، کیسے ہوگیا تمھیں یقین کوئی دستاویزی ثبوت ہے تمھارے پاس؟ کوئی فلم بنوا رکھی ہے تم نے اس کے جرائم کی؟ تم ہوتے کون ہو ایک شہری کو بلا ثبوت مجرم قرار دینے والے؟"

قانون کا ماہر ہم سے مخاطب تھا۔ خالص عدالتی سوال تھے اور عدالتی کارروائی ہم نے مایوس ہوکر فون رکھ دیا۔

بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ بریگیڈیئر مارشل لاء کو ساری بات بتائی جائے۔ مارشل لاء ہیڈکوارٹر میں جنرل کے بعد سب سے سینئر افسر وہی تھے ہم انھیں کے سٹاف آفیسر تھے ان کے پاس گئے اور کہا۔

"سر! ایک غلطی ہوگئی ہے"۔

"کیا؟"

"ایک آدمی گرفتار ہوگیا، ہمارے ہاتھوں"۔

"کیسے؟"

ہم نے پوری رام کہانی سنادی۔

انھوں نے فریقین کو طلب کیا، مذاکرات ہوئے اور تھوڑی دیر میں انھیں بھی یقین ہوگیا کہ الزامات صحیح ہیں درخواست گذار سچا ہے، ملزم عیار۔

بریگیڈیئر مارشل لاء نے انٹرکام پر (DAJAG) کو ہدایت کی کہ مارشل لاء آرڈر نمبر ۱۲ کے تحت ایک شخص کو جیل بھجوانا ہے۔ ضروری کاغذات تیار کریں۔ اس ضابطے کے تحت کسی بھی ایسے شخص کو گرفتار کیا جا سکتا ہے جو نقص امن کا مجرم ہو ایڈووکیٹ آئے اور ہمیں گھورتے ہوئے کاغذات تیار کرنے لگے۔ ملزم باقاعدہ طور پر حوالۂ پولیس کر دیا گیا۔ ہم نے اپنی لکھی ہوئی چٹ پھاڑ دی اور باقاعدہ "قانونی" کاغذات تھانیدار کے حوالے کر دیے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہم اسمبلی کے برآمدے سے گذر رہے تھے کہ ایک وکیل کالا کوٹ پہنے، سیاہ ٹو لگائے، شفاف عینکوں سے گھورتے ہمیں ملے پوچھا

"کیپٹن اشفاق کہاں بیٹھتے ہیں جی؟"

"کیوں جی کیا کام ہے آپ کو ان سے؟"

"جی انھوں نے میرے ایک موکل کو گرفتار کرلیا ہے ایک شخص کے جھوٹے الزام پر"۔

"اچھا جی! تو اب آپ کیا کرنے آئے ہیں؟ موکل تو آپ کا حوالات میں ہوگا؟"

ذرا تلخی سے۔

"جی میں پوچھنے آیا ہوں، انھوں نے کس لاء کے تحت گرفتار کیا ہے میرے موکل کو؟"

"آپ کو نہیں معلوم ملک میں کون سا لاء رائج ہے"۔

"کون سا لاء ہی جی؟"

"مارشل لاء"

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اب انھوں نے ہماری وردی پر لگی نام کی تختی پڑھی اور نرم ہوتے ہوئے بولے
" جی میرا مطلب ہے مارشل لاء کا بھی کوئی نہ کوئی ضابطہ تو ہوگا نا خالی مارشل لاء کا تو کوئی مطلب نہ ہوا "۔

لیکن اب تیزی دکھانے کی ہماری باری تھی ۔

" دیکھیے صاحب ! مارشل لاء کا مطلب ہے حکمران کی مرضی ۔ جی چاہا آج ضابطہ نمبر پچیس جاری کر دیا ۔ کل کو محسوس ہوا اس میں کوئی سقم رہ گیا کوئی حرج نہیں ، ضابطہ نمبر پچیس منسوخ ، ضابطہ نمبر چھبیس جاری کیا جاتا ہے "۔

وہ ششدر سے رہ گئے ہماری شکل دیکھنے لگے ؎

ٹک ٹک دیدم
دم نہ کشیدم

پھر بولے

" جی میری سمجھ میں نہیں آئی بات "۔

" میں نے خلاصہ بیان کر دیا ہے آپ کو آسان ترین لفظوں میں سمجھیں نہ سمجھیں آپ کی مرضی "۔ یہ کہتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے ۔

تھوڑی دیر میں وہی صاحب ہمارے دفتر میں آئے ، بڑی لجالت سے بولے

" کوئی حل بھی بتائیے نا اس مشکل کا "۔

" دیکھیے صاحب ! آپ نے پہن رکھا ہے کالا کوٹ جو بحث کی گرمی منعکس نہیں کرتا ، جذب کرتا ہے ۔ آپ کو تو آتا ہے مزہ بات بڑھانے میں ۔ ہمارے پاس اتنا وقت کہاں ۔ مختصراً بات یہ ہے کہ آپ جس قانون کے تحت مقدمات لڑتے ہیں اس میں چوری کا مال برآمد ہو جائے تو چور کے خلاف گواہی کے طور پر استعمال ہوتا ہے مقدمہ چلتا رہتا ہے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا مؤکل پیسوں کی ادائیگی کر دے ۔ آئندہ کے لیے ایسی حرکتوں سے توبہ کرے تو اسے فوراً رہا کر دیا جائے گا آپ اسے

پیسوں کی ادائیگی پر راضی کر سکتے ہیں تو ٹھیک ورنہ اپنی اب تک کی فیس لے کر الگ ہو جائیں اس کے باہر آنے کی کوئی صورت نہیں اس سے زیادہ اس موضوع پر ہم کچھ کہنا چاہیں گے نہ سننا "۔

دوسرے دن تھانیدار نے فون کیا کہ ملزم ہم سے ملنا چاہتا ہے ۔ وہ آیا اور بولا
" سر ! میں پیسے دینے کے لیے تیار ہوں ۔ لیکن میں نے اس کے چھیانوے ہزار نہیں چھپن ہزار دینے ہیں صرف ــــــ باقی اس نے مجھے نہیں فلاں کو دیے تھے جو کبھی میرا شریک تھا لیکن اب وہ بھاگ کر بیرونِ ملک چلا گیا ہے "۔

شکایت کنندہ نے چھپن ہزار لینے پر رضامندی ظاہر کی ۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد یہ کیس مکمل ہوا ۔ شکایت کنندہ کو پیسے مل گئے مجرم حسبِ وعدہ چھوڑ دیا گیا ۔

ہندوستان سے جتنے راجے مہاراجے ، نواب اور شہزادے لٹ لٹا کر پاکستان پہنچے ان کی اکثریت کراچی میں رہائش پذیر ہے ۔ تلافی مافات کے لیے ان میں سے بیشتر کو حکومت نے مختلف جگہوں پر زمینیں الاٹ کیں لیکن کہاں وہ ناز ، وہ لاڈ ، وہ پیار ، صباحت و ملائمت ؎

وہ نازک نازک سے پاؤں جو فرشِ گُل پہ زخمی ہوں
کلیاں راہوں میں بکھری ہوں تو کلیاں جن کو چبھتی ہوں

کہاں ماحول کی اجنبیت ، گردشِ حالات ، فکرِ معاش ، حیرانیاں ، پریشانیاں

ایک دفعہ فون کی گھنٹی جو بجی تو پتہ چلا وصال کی آرزو لیے ایک شہزادی ہم سے مخاطب ہے ۔ ہم نے اس سے پہلے شہزادیوں اور پریوں کا حال صرف قصوں کہانیوں میں پڑھ رکھا تھا ۔ متمنی ہوئے کہ شہزادی کو قریب سے دیکھیں ۔ انھیں ملاقات کا وقت دے دیا ۔

وہ آئیں اور ہم انھیں دیکھتے رہ گئے ۔ گئے دنوں کی دھول چہرے پر بکھری تھی ایک الجھن تھی جس نے پیشانی کو عرق آلود کر دیا تھا ۔ پر ایک وقار تھا جو ماضی کا ترجمان

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

تھا۔ اردو زبان کی دلکشی تھی جو لہجے میں سمٹ آئی تھی۔ بولیں

"ہم کبھی چار دیواری سے باہر نہیں نکلے، لاج کا گہنا اتار کر آپ کے پاس انصاف کے لیے آئے ہیں کہ سمٹ سمٹ کر دم گھٹنے لگا ہے۔"

معلوم ہوا جو زمین حکومت نے انھیں الاٹ کی تھی اس پر کسی خان صاحب نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ایک کونے میں ہوٹل کھول رکھا ہے اور قبضے کو دوام بخشنے کے لیے دوسرے سرے پر ایک مسجد کی تعمیر شروع کر رکھی ہے۔

ہم نے بریگیڈیئر مارشل لاء سے اجازت لے کر متعلقہ تھانیدار کو ہدایت کی کہ خان کو فوری طور پر پیش کیا جائے، دوسرے دن خان حاضر تھا۔ ہم نے علیحدگی میں خان سے گفتگو کی۔ پٹھانوں کی امانت، دیانت اور وفاؤں کی روایات سے انحراف کرنے پر لعنت ملامت کی۔ پھر پوچھا سیدھی انگلیوں گھی نکلے گا یا انگلیاں تڑوائی جائیں اس نے سیدھی سچی بات بیان کر دی۔

"سر بات یہ ہے کہ آپ کے کہنے پر میں زمین چھوڑنے کے لیے تیار ہوں لیکن شہزادی کے گھرانے میں جوان مرد ایک بھی نہیں ہے۔ بیٹیاں ہی بیٹیاں ہیں وہ اس پر قبضہ برقرار رکھ ہی نہیں سکتیں۔ میں چھوڑ دوں گا تو اور بہت سے لوگ ہیں جو اس زمین پر دانت رکھے ہوئے ہیں۔ شہزادی کو تو یہ ملنے سے رہی۔ مارشل لاء کے بل بوتے پر وہ کس کس سے لڑیں گی۔ پھر مارشل لاء آج ہے کل نہیں۔ سول عدالت سے تو ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا کہ مجھے بیٹھے بٹھائے گرفتار کروا لیں۔"

"پھر؟ مطلب کیا ہے تمھارا؟"

"مطلب یہ ہے جی کہ شہزادی صاحبہ کو آپ سمجھائیں انھوں نے خالی زمین کرنی کیا ہے کھیتی باڑی تو وہ کروانے سے رہیں۔ کل بھی بیچنی ہے آج بھی ——— جو پیسے لینے ہیں مجھ سے لے لیں۔"

ہم نے میلے چکٹ کپڑوں میں ملبوس اس پٹھان کو دیکھا کہ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے، ڈاڑھی الجھی ہوئی۔ جوتا پھٹا ہوا اور وہ لاکھوں کا سودا کر رہا تھا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ہم نے اسے وارننگ دی۔

"زمین کی قیمت لاکھوں تک پہنچتی ہے، تم بلیک میل کر کے کم قیمت پر زمین لینا چاہتے ہو؟"

"سر قیمت کی کوئی بات نہیں، شہزادی صاحبہ جو قیمت کہیں گی میں ادا کروں گا بات یہ ہے کہ میں زمین چھوڑنا نہیں چاہتا، چھوڑ دی تو کئی "گرگے" جھپٹ پڑیں گے، شہزادی صاحبہ کو نہیں ملے گی۔"

بات دل کو لگتی تھی۔ ہم نے فون پر شہزادی سے رابطہ قائم کیا اور ملاقات کے آرزو مند ہوئے۔ خان سے "مذاکرات" کا خلاصہ پیش کیا۔ انھوں نے مناسب جانا کہ زمین کے جنجال سے واقعی چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ دیگر شہزادیوں سے مشورے کے بعد انھوں نے ایک قیمت بتائی جو مارکیٹ کی نسبت کچھ زیادہ تھی۔ اور لاکھوں تک پہنچتی تھی لیکن خان نے اس پر صاد کیا اور زمین خرید لی۔

ہمارے حصے میں شہزادی کے چہرے پر طمانیت کی مسکراہٹ آئی۔ ایک عشائیے کی دعوت بھی جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی "ہاں، ہاں" کو دباتے ہوئے ہم نے مسترد کر دی۔ پورا گھرانہ "شہزادیوں" پر مشتمل تھا۔ کون جانے پریوں کے جھرمٹ میں بندہ بشر پر کیا گذرے، سنتے ہیں زور آور پریاں انسان کو مکھی بنا کر گھر کی دیواروں پر چپکا دیتی ہیں، جب چاہا انسان بنا لیا جب چاہا مکھی۔

تو صاحبو! کہنا ہمارا یہ تھا کہ جب تک ہم قانون کے چکر میں نہیں پڑے تھے لوگوں کا کوئی نہ کوئی کام ہم سے نکل ہی جاتا تھا۔ کہ اقتدار میں بڑی قوت ہے یہ نشتر ہے ڈاکٹر کے ہاتھوں میں ہو تو شفا کا پیام، ڈاکو کے ہاتھ میں ہو تو سکون کا اختتام، جنرل ضیاء الحق نے بڑی شائستگی کے ساتھ سیاستدانوں کو "زیر حفاظت" لے کر اقتدار سنبھالا تھا اور اقتدار سنبھالنے کے بعد بھی سول عدالتوں کو مکمل اختیارات دیئے رکھے جو ان اختیارات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مارشل لاء حکام کے فیصلوں پر حکم امتناعی STAY ORDER بڑی فراخ دلی سے جاری کرتی رہیں۔ بعض

اوقات کوئی مجرم بڑی جانفشانی کے بعد قابو آتا اس کے جرائم کے ثبوت بہم پہنچائے جاتے، مقدمہ چلتا ، سزا سنائی جاتی اور وہ سول عدالت سے حکم امتناعی لے آتا۔ کی کرائی محنت پر پانی پھر جاتا ، مجرم عین آنکھوں کے سامنے دندناتا پھرتا ، پارٹیاں لوٹتا اور اپنی حرکتیں جاری رکھتا ، ہمیں سخت جھنجلاہٹ ہوتی یہی جھنجلاہٹ ہم نے ایک دفعہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی خدمت میں پیش کر دی ۔

ایک دفعہ جنرل ضیاء الحق کراچی آئے ، فلیٹ کلب میں انھوں نے گیریژن افسروں سے خطاب کیا۔ تقریر کے بعد سوالات کی دعوت دی ۔ بھرے ہال میں ہم کھڑے ہو گئے بڑے ادب سے کہا :۔

SIR, WE THE MEN IN UNIFORM ARE SHOULDERING THE YOKE OF THE COUNTRY AND YOU HAVE HANDED OVER THE REINS TO THE COURTS. TOMOR ROW PEOPLE WILL ACCUSE THE OX NOT THE REIN HOLDERS. WHY DO YOU WANT TO SPOIL THE IMAGE OF THE ARMY.?

(ملک کا جُوا ہم فوجیوں نے اٹھا رکھا ہے اور باگیں آپ نے سول عدالتوں کے ہاتھوں میں تھما دی ہیں ۔ کل کو لوگ بیلوں پر طعنہ زنی کریں گے باگیں تھامنے والے تو صاف بچ جائینگے ، آپ کیوں فوج کا تاثر خراب کرنے پر تُلے ہوئے ہیں ؟)

جواب میں جنرل ضیاء نے جیب سے پیکٹ نکالا ، ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی ، لائٹر سے اسے جلایا پھر ایک کش لگایا ۔ اس دوران میں ایک سناٹا تھا جو ہال پر طاری تھا سامعین میں ہم کھڑے تھے اور سٹیج پر جنرل ضیاء الحق ۔ جانے کتنے لمحے اسی کیفیت میں گذر گئے ۔ پھر انھوں نے ہماری طرف نظر اٹھائی اور کہا

"REPEAT YOUR QUESTION'

("سوال دہراؤ")

ہم نے دہرا دیا تب وہ گویا ہوئے ۔

POWER IS INTOXICANT THINGS HAPPEN BEFORE YOU UTTER THEM. IT IS VERY DIFFICULT TO CON TAIN ONESELF WHEN INTOXICATED. I DO NOT WANT

TO SPOIL YOU. LET IMAGE BE SPOILED IT IS AL READY AN ABSTRACT NOUN.

(طاقت بڑی نشہ آور چیز ہے ، احکام لب ہلنے سے پہلے پورے ہو جاتے ہیں آدمی نشے میں ہو تو خود کو سنبھالنا بڑا مشکل ہے میں تمھیں برباد نہیں دیکھنا چاہتا ۔ تاثر خراب ہوتا ہے تو ہوتا رہے ۔ یہ پہلے بھی تو مہمل سا نام ہی ہے نا")

اس کے جواب میں بہت سے افسر چھٹے اور تابڑ توڑ سوالات کیے خلاصہ جن کا یہ تھا کہ فوجی عدالتوں کے ساتھ ساتھ سول عدالتوں کو مکمل اختیارات دیے رکھنے سے فوجی عدالتوں کا قیام تماشائے محض بن کر رہ گیا ہے ۔ یا تو سب کچھ انھیں تھما دیں ہمیں لے چلیں واپس بیرکوں میں یا پھر توڑ دیں ان عدالتوں کو یہ ایک نیام میں دو تلواروں اور ایک ملک میں دو قانون کے تجربات چہ معنی دارد ؟

یہ بات جنرل ضیاء کے مخالفین بھی مانتے ہیں کہ بہت بُردبار اور متحمل مزاج میں سخت سے سخت تنقید خندہ پیشانی سے برداشت کر جاتے ہیں یہاں تو معاملہ بقول ان کے اپنے " انتخابی ادارے" (ELECTORATE) کا تھا وہ مسکرا مسکرا کر تند و تیز سوال سنتے رہے اور شگفتہ شگفتہ جواب دیتے رہے طویل سلسلہ چلا ۔

یہ سوال و جواب بے معنی نہیں تھے ۔ ہر دھڑکنے والا دل کشتی کے ڈولنے پر گھبراتا ہے اور تجسس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے جس کے ہاتھ میں پتوار ہو ۔ ناخدا کے بارے میں یہ یقین ہو جائے کہ اسے راستوں کا علم ہے خطروں سے آگاہی اور طوفانوں سے ٹکرانے کی صلاحیت بھی وہ رکھتا ہے تو دل مطمئن ہو جاتا ہے دھڑکنیں پُر سکون ۔

جنرل ضیاء کا کہنا تھا کہ سول مشینری نے انتہائی نازک حالات میں ملک کو سنبھالے رکھا ہے ، ۴۷ء میں اس وقت نظم و نسق چلایا ہے جب بیٹھنے کے لیے کرسیاں، لکھنے کے لیے کاغذ اور باندھنے کے لیے دھاگہ تک نہیں ہوتا تھا ۔ جنگوں کے دوران میں جب سائرن چیختے تھے ، جنگی طیارے گرجتے پھرتے تھے اور توپوں کی گھن گرج

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

سے درودیوار ملتے تھے۔ تو یہی شہری تھے جو پوری استقامت سے اپنے اپنے مورچوں پر ڈٹے رہے۔ اب انھیں یکسر اختیارات سے محروم کر کے کُلّی اختیار سنبھالنے سے ہمارا اپنا کام بڑھتا ہے ان کا کچھ نہیں جاتا۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان کے قبلے درست کر دیے جائیں۔ انھیں یہ بات ذہن نشین کرادی جائے کہ وہ حاکم نہیں خادم ہیں قوم کے۔

جنرل ضیاء الحق کے دلائل اپنی جگہ، اور یہ حقیقت اپنی جگہ کہ مارشل لاء کو نافذ رکھتے ہوئے جمہوریت کے تجربے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ بعد کو ایک ضابطہ جاری کرنا پڑا جس کے تحت فوجی عدالتوں کے احکامات کو سول عدالتوں کی دست بُرد سے محفوظ کر دیا گیا۔ اس سے پہلے یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ خود مارشل لاء کو ملک کی سب سے بڑی عدالت میں چیلنج کر دیا گیا۔ صدر ضیاء الحق کی عالی ظرفی کہ وہ انتہائی صبر کے ساتھ پوری کارروائی دیکھتے رہے، پڑھتے رہے، سنتے رہے۔ عدالت نے خود ہی فیصلہ دیا کہ مارشل لاء وقت کی ضرورت تھا۔

مارشل لاء وقت کی ضرورت تھا یا نہیں، سچی بات ہے فوج کی ضرورت کبھی نہیں رہی۔ فوجی کی تربیت انتہائی مختلف ماحول میں ہوتی ہے اسے دو جمع دو، چار کی طرح کے اصول سکھائے جاتے ہیں "ایڈوانس" کے حکم پر مارچ اور "فائر" کے آرڈر پر فائرنگ کی اس سے توقع کی جاتی ہے اور فوج اس وقت تک فوج ہے جب تک احکام کی فوری تعمیل اس کا خاصہ ہے۔

فوج میں گرچہ جنرل ضیاء الحق اور ہم جیسے ہرفن مولا ذہین افراد بھی پائے جاتے ہیں لیکن ایک سیدھے سادھے فوجی کو سول مشینری چلانے کے لیے استعمال کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک پی ٹی ماسٹر کو ادبِ عالیہ پڑھانے پر مامور کر دیا جائے کہ جس میں لطافتیں ہیں، نزاکتیں ہیں، ادب ہیں، آداب ہیں، معاشقے ہیں، آہیں ہیں، لفظوں کی تکرار ہے، مختلف معانی پر اصرار ہے۔ مارشل لاء میں رہتے ہوئے ہم نے بیوروکریسی کو قریب سے دیکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ؎

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

ایک بار ہمیں کراچی جیل کے چند قیدیوں کی طرف سے ایک درخواست ملی جو انھوں نے بڑی مشکلوں سے جیل کے باہر سے پوسٹ کروائی تھی۔ درخواست کے مطابق ان کی سزائیں کب کی پوری ہو چکی تھیں لیکن رہائی عمل میں آتی تھی نہ یہ بتایا جاتا تھا کہ وہ کیوں قید ہیں؟ ؎

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

والا معاملہ تو تھا نہیں۔ سیدھے سادھے قیدی تھے جو یوسفؑ کی طرح پارسا تھے نہ حسین کہ مہکتے جسموں کی توبہ شکن انگڑائیوں سے منہ موڑ کر جیل آئے ہوں یا کہ ڈور بھی مصر کے حکمرانوں کے ہاتھوں میں نہ تھی۔ کہ ان کا کوئی خواب قیدیوں کی رہائی کا سبب بنتا ہم نے ہوم سیکریٹری سے وضاحت چاہی۔ ہوم سیکریٹری نے لاء ڈیپارٹمنٹ سے مشورہ کیا کہ مارشل لاء کی اس پوچھ گچھ کا کیا جواب دیا جائے لاء سیکریٹری نے جو جواب دیا، کچھ یوں تھا۔

(قوسوں کے درمیان کے الفاظ ہمارے ہیں ان سے خط کی اصل روح اجاگر ہوتی ہے)

ہوم سیکریٹری کی خدمت میں بحوالہ چھٹی نمبر ...... مورخہ ......

در طلب وضاحت مراسلہ از مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون سی بر موضوع مذکورہ بحوالہ نمبر ...... مورخہ ....

مناسب ہوگا کہ ہوم سیکریٹری کوئی قدم اٹھانے سے پہلے (نہ اٹھائیں تو بہتر ہے خواہ مخواہ کیلوریز ضائع ہوں گی) جیل حکام کی رائے طلب کریں اور معلوم کریں کہ درخواست کنندگان کس جرم میں قید رکھے گئے تھے۔ سزا کی میعاد کتنی تھی اور آیا رہائی کی تاریخ وہی بنتی ہے جو درخواست

کنندگان نے تحریر کی ہے ان کی بات درست پائی جائے تو (ابھی انھیں چھوڑا نہ جائے پہلے) جیل حکام سے ان وجوہات کی تفصیلات طلب کی جائیں جن کی بنا پر رہائی میں اتنی تاخیر ہوئی۔

اس رپورٹ کی وصولی کے بعد اگر ہوم سیکریٹری محسوس فرمائیں کہ قیدیوں کی رہائی میں کوئی قانونی سقم ہے (جو یقیناً موجود ہوگا نہیں ہے) تو وضاحت کے لیے ہمارے شعبے سے رجوع کیا جائے (ہم کوئی نہ کوئی سقم ڈھونڈھ نکالیں گے آخر بیٹھے کس لیے ہیں؟) ہمارے مشورے کی روشنی میں مارشل لاء حکام کے خط کا جواب دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

(اس خط وکتابت کے دوران قیدیوں کو جیل ہی میں رہنے دیا جائے جانے کب کوئی نکتہ ایسا پیدا ہو جائے جس کی رُو سے ان کا جیل میں قیام لازمی ٹھہرے)

ملاحظہ فرمایا آپ نے ادب عالیہ کا یہ نمونہ اس جیسے کتنے ہی شہ پارے بیورو کریسی کے ہاتھوں روزانہ تخلیق ہوتے ہیں ایک اور واقعہ پیشِ خدمت ہے۔

حکومت سندھ کے دو پریس ہیں ایک کراچی میں، ایک خیر پور میں، دونوں وزارت صنعت کے ماتحت ہیں۔ مارشل لاء سے پہلے کی بات ہے دونوں جگہوں کے پریس مینجروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ ایک دوسرے سے ڈیوٹی بدل لیں کہ دونوں اپنی اپنی جگہ برسوں سے مقیم تھے۔ خیر پور والے صاحب تو جھٹ سے کراچی پہنچ گئے، کراچی والے صاحب ڈٹے رہے ان کی ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے انھیں زبردستی رُخصت پر بھجوا دیا گیا اس دوران مارشل لاء کا نفاذ ہوا تو وہ جانے کیسے وزارتِ صنعت کے منظورِ نظر بن گئے۔ مارشل لاء کے فوراً بعد انھیں کراچی ہی میں ڈیوٹی پر لے لیا گیا۔ خیر پور والے صاحب کو پھر خیر پور جانے کی نوید سنائی گئی۔ وہ برسوں بعد آئے تھے، اہلیہ بیمار تھیں علاج جاری تھا، انھوں نے مارشل لاء میں اپیل داغ دی ہم نے وزارتِ صنعت سے وضاحت چاہی تو جواب آیا کہ انھیں کراچی میں تعینات کر دیا گیا ہے ہم نے تصدیق کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ اشک شوئی کی خاطر خیر پور والے صاحب کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

آئندہ احکام تک عارضی ڈیوٹی پر کراچی ہی میں کام کرتے رہیں۔ پوسٹنگ ان کی خیر پور ہی میں رہی۔ جب سختی سے پوچھا گیا کہ یہ کیا چکر ہے تو وزارتِ صنعت کی طرف سے مکمل دو صفحوں کا جواب آیا جس میں یہ رونا رویا گیا تھا کہ اگر کراچی والے صاحب کو خیر پور بھجوایا گیا تو شعبے میں سخت بحران پیدا ہو جائے گا۔ وہ خیر پور چلے بھی گئے تو خیر پور کا کام نہیں چل سکے گا کیونکہ وہ کسی بھی وقت قبل از پنشن رخصت پر جا سکتے ہیں کہ سروس کے آخری مرحلے میں ہیں (گویا کراچی سے قبل از پنشن رخصت پر جانا منع ہے) ہم بھی چھوڑنے والے نہیں تھے ان کے دو صفحوں کے جواب میں ایک جملہ لکھا۔

PLEASE INTIMATE THE DATE FROM WHICH MR.........
IS ENTITLED TO GO ON LEAVE PENDING RETIRE
MENT

معلوم ہوا قبل از پنشن رخصت پر تشریف لے جانے میں بھی ابھی ایک سال آٹھ ماہ بقایا ہیں اب مضمون لکھنے کی باری ہماری تھی۔ ہم نے مختصر سا مضمون لکھا، لیکن انگریزی ذرا فصیح و بلیغ استعمال کی کہ جس پر عمل ہو جاتا تو سندھ کی متعلقہ وزارت بھک سے اڑ جاتی لیکن بھلا ہو بریگیڈیر مارشل لاء کا۔ انھوں نے بڑے اطمینان سے ہماری تجاویز پر قلم پھیرا۔ آئندہ سے انگریزی کے معاملے میں ہاتھ نرم رکھنے کی ہدایت کی۔ اور کیس ہم سے لے کر ایک اور افسر کے حوالے کر دیا۔

خط وکتابت کے طویل سلسلے اسی طرح کے انجام پر منتج ہوتے۔ اسی طرح کی تلخیوں کو چکھ کر، طوالتوں سے گھبرا کر ایک شہری نے لکھا۔

"مجھے یقین ہے مارشل لاء انتظامیہ کی نرمیوں سے بے جا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے سول حکام نے مارشل لاء کو گڑیوں کا کھیل بنا رکھا ہے۔ میری درخواست کو اتنے مہینے ہونے کو آئے۔ آپ کی واضح ہدایات کے باوجود اب تک کچھ نہیں ہوا۔ میں کب تک ______ خود کو انتظار کی اس کلفت میں مبتلا رکھوں، اجازت دیجیے کہ میں اپنی درخواست مؤرخہ ______ کو منسوخ سمجھے جانے کی التجا کر سکوں۔

آپ کے تعاون کا شکریہ بہت بہت ______ زحمت افزائی پر معذرت"

بیوروکریسی کی کارگذاریوں کی داستان بہت طویل ہے مارشل لاء میں اپنے مختصر قیام کے دوران ہم نے اسے ایک بار زیر ہوتے دیکھا کچھ لڑکیوں کے ہاتھوں۔

سندھ میں کل پانچ میڈیکل کالج ہیں۔ جن میں ہر سال سترہ سو کے لگ بھگ طلبہ و طالبات کو داخلہ ملتا ہے قواعد وضوابط میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ "حکومت منتخب کیے گئے طلبہ کو صوبے کے کسی بھی میڈیکل کالج میں بھیجنے کا حق محفوظ رکھتی ہے" حکومت یہ حق محفوظ رکھے رکھتی تو شاید خیریت گذرتی۔ لیکن ہوا یوں کہ مارشل لاء سے پہلے کی حکومت نے اس اچھے بھلے محفوظ حق کا برملا استعمال کیا اور سندھ میڈیکل کالج (ایس ایم سی) کراچی میں داخل طالبات میں سے چھتیس لڑکیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے پیپلز میڈیکل کالج (پی ایم سی) نواب شاہ روانہ ہوجائیں اسی طرح پی ایم سی کی اتنی ہی لڑکیوں کو ایس ایم سی میں تبادلے کے احکامات دیے گئے کہا یہی گیا کہ یہ تبادلے صوبے میں اخوت کو فروغ دینے کے لیے کیے گئے ہیں کہ کراچی کی طالبات اندرونِ سندھ سے روشناس ہوجائیں اور اندرونِ سندھ کی لڑکیوں کو نئی روشنیاں دیکھنے کا موقع مل سکے لیکن کہنے والوں نے ان احکامات کو کنبہ نوازی اور اقرباء پروری قرار دیا۔ کہ ایم ایس سی کے طلبہ کو جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سنٹر اور امراض قلب جیسے بہترین ادارے کی خدمات حاصل ہیں اندرون سندھ سے آنے والی لڑکیوں میں بعض سیکنڈ ڈویژن بھی تھیں۔ انھیں خوشی تھی کہ تربیت کی بہتر سہولتیں مل رہی ہیں۔ پھر کراچی تو شہر آرزو بھی ہے کراچی سے جانے والی لڑکیاں اسے ظلم قرار دیتی تھیں، کہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونے کے باوجود انھیں نسبتاً کم درجے کے کالج میں بھیجا جا رہا تھا والدین سے دور رہ کر ایک جوان لڑکی کو جو مشکلات پیش آسکتی ہیں وہ ان کے علاوہ تھیں۔ مرتی کیا نہ کرتیں یہ لڑکیاں نواب شاہ سدھار گئیں۔ لیکن ماحول راس آیا نہ کالج ان کا کہنا تھا کہ کالج کھلنے اور بند ہونے کے اوقات میں ہوسٹل اور کالج کے رستے میں اوباش قسم کے لڑکے کھڑے ملتے ہیں جو طالبات پر چست کرتے آوازے کستے ہیں جس ہسپتال کی سہولتیں کالج کو مہیا تھیں وہاں مریضوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، کہ

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

اندرونِ سندھ کے لوگ اپنے گاؤں کے حکیموں پر زیادہ اعتقاد رکھتے ہیں کوئی بھولا بھٹکا مریض آبھی جاتا تو زبان کا مسئلہ آڑے آجاتا، جوں توں کرکے کچھ عرصہ تو انھوں نے وہاں گذارا، چوتھا سال قریب آیا تو مستقبل مخدوش نظر آنے لگا۔ کہ تین سال کی پڑھائی کے بعد انھیں انجکشن لگانا آتا تھا نہ بلڈ پریشر چیک کرنا، پہلے تو انھوں نے یہ کیا کہ اپنے طور پر کراچی آکر ایس ایم سی میں کلاسیں اٹینڈ کرنا شروع کردیں۔ ساتھ ساتھ انفرادی طور پر درخواستیں گذارنا شروع کیں، کسی کی والدہ بیمار تھیں، کسی کے والد کسی کے مالی حالات نواب شاہ رہنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ کسی کو وہاں کی آب وہوا راس نہ آتی تھی۔ دل کی دھڑکنوں میں انتشار محسوس ہوتا تھا کچھ دن تو یہ طریق چلا لیکن پھر انتظامیہ آڑے آگئی۔ تمام درخواستیں مسترد کردی گئیں اور طالبات کو ہدایت کی گئی کہ واپس نوابشاہ جائیں خبردار جو ایس ایم سی میں نظر آئیں اس پر لڑکیاں بپھر گئیں یہیں سے اس کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

دفتری اوقات کی ابتدا تھی ہم ابھی ڈاک ہی دیکھ رہے تھے۔ کہ کسی نے آکر اطلاع دی۔ کہ اسمبلی بلڈنگ کے باہر کچھ لوگوں نے جلوس نکال رکھا ہے۔ ہم برآمدے میں آئے تو دیکھا کہ اسمبلی بلڈنگ کے صدر دروازے کے عین سامنے بہت سی لڑکیاں بینر اٹھائے کھڑی ہیں۔

"مظلم کی راہیں روک دو"

"چادر کو تحفظ دو"

"تعلیم میں سیاست بند کراؤ" وغیرہ وغیرہ

ان دنوں مارشل لاء کے لیے الگ سے افسر متعین نہیں تھے زیادہ تر افسر ایسے تھے جو پہلے اپنے یونٹوں اور ہیڈ کوارٹروں میں جاکر کام کرتے تھے اور دس گیارہ بجے کے قریب مارشل لاء کے دفتروں میں آجاتے تھے۔ اور شام ڈھلے تک مصروف رہتے تھے چند افسر تھے جنھیں خاص طور پر مارشل لاء کے لیے باقی کاموں سے فارغ کردیا گیا تھا ہم انھی میں سے ایک تھے۔ اور اسی ناطے اسمبلی بلڈنگ میں موجود تھے ہم نے کور

ہیڈکوارٹر فون کیا اور بریگیڈیر مارشل لاء بریگیڈیر عبدالرشید قریشی کو صورت حال سے مطلع کر کے احکامات چاہے۔ انھوں نے مناسب اقدامات کی ہدایت کی اس دوران میں ایک اور کرنل صاحب بھی آ پہنچے وہ گیٹ سے گذر کر آئے تھے۔ اور مظاہرہ دیکھ کر سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔ ہم نے انھیں بریگیڈیر مارشل لاء کی ہدایات پہنچائیں اور لڑکیوں سے مذاکرات کے لیے کہا

کرنل صاحب پیچھے گئے۔ مظاہرین کے نمائندوں کو طلب کیا جو مناسب الفاظ تراش کرلانے کی بجائے پنجے تیز کر کے آئی تھیں اور بات کرنے سے زیادہ رونے کے لیے تیار تھیں انھیں انتہائی نرمی سے بتایا گیا کہ وہ کوئی میمورنڈم دے دیں ان کی بات "اوپر" پہنچادی جائے گی۔

چند منٹ کے مذاکرات نتیجہ خیز ثابت ہوئے، مظاہرہ ختم کردیا گیا لڑکیوں نے بینر لپیٹے اور ایک بس میں سوار ہو کر غائب ـــــــ بعد میں معلوم ہوا کہ بس پی ایم سی کی ہے۔ اور بغرض مظاہرہ نواب شاہ سے اغوا کر کے کراچی لائی گئی ہے گویا حکومت کے وسائل مظاہروں کے لیے استعمال کیے جارہے ہیں

میری بلی مجھی کو میاؤں

ہم نے پولیس کو ہدایت کی کہ اس بس کو فوری طور پر قبضے میں لے لیا جائے لیکن مجال ہے جو بس کا پتہ چلا ہو جانے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

میمورنڈم مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل جہانزیب ارباب کو پیش کیا گیا۔ ہیلتھ سیکریٹری کو طلب کیا گیا، تفصیلی بات چیت ہوئی۔ جنرل کی رائے میں لڑکیوں کے آخری سالوں میں انھیں ایس ایم سی میں پڑھائی جاری رکھنے کی اجازت دینے میں کوئی حرج نہ تھا۔ بھلائی ہی بھلائی تھی کہ ان کا معیار تعلیم بہتر ہو رہا تھا۔ ہیلتھ سیکرٹری کے بقول قوانین کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ قواعد کی روح مجروح ہوتی ہے۔ ضوابط دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے۔

مارشل لاء اور بیوروکریسی میں فائلوں کے تبادلے شروع ہوئے مذاکرات نے

طول پکڑا تو پی ایم سی کی بسیں پھر نمودار ہوئیں اور لڑکیاں بینر اٹھائے اسمبلی بلڈنگ کے سامنے مظاہرہ کرنے کو موجود۔ مارشل لاء کا مزاج بہت نازک ہوتا ہے بگڑ گیا حکم جاری ہوا کہ تمام طالبات کے والدین کو خط لکھے جائیں کہ یا تو انھیں پی ایم سی بھیجو پڑھنے کے لیے ورنہ نام خارج کر دیے جائیں گے۔ خط جاری کر دیے گئے۔

انھی دنوں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاءالحق کراچی آ پہنچے۔ لڑکیاں نچلی بیٹھنے والی کہاں تھیں۔ تریا ہٹ تو مشہور ہے نا۔ انھوں نے دن رات ایک کر دی۔ اور بیوروکریسی کی تمام تر مزاحمت کے باوجود صدر سے ملاقات کا وقت لینے میں کامیاب ہوگئیں۔ صوبائی سیکریٹریٹ میں ہیلتھ سیکرٹری اور پرنسپل ایس ایم سی کی موجودگی میں لڑکیوں کی ایکشن کمیٹی کی صدر اور جنرل سیکریٹری کی صدر سے ملاقات ہوئی۔ صدر بڑی شفقت سے پیش آئے۔ لڑکیاں جانے کب کی بھری بیٹھی تھیں۔ دو میٹھے بول سنے تو رونے پر اتر آئیں ملاقات کے بعد بھی دیر تلک روتی رہیں اور صدر کو دعائیں دیتے ہوئے صوبائی حکام کو مختلف خطابات سے نوازتی رہیں معلوم ہوا زبانی احکامات دے دیے گئے ہیں کہ تمام لڑکیوں کو ایس ایم سی میں داخلہ دیا جائے۔

خیال تھا کہ یہ کہانی ختم ہو جائے گی۔ لیکن دفتری فائلوں میں چلنے والی کہانی ہی کیا جو ختم ہو جائے۔ بیوروکریسی نے اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا رکھا تھا اتنی جلد کیسے مان جاتے۔

فرق صرف یہ پڑا کہ وہ خط و کتابت جو پہلے صوبائی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ہو رہی تھی۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سیکریٹریٹ کے نام کر دی گئی۔ تفصیلی رپورٹ لکھی گئی، قوانین کے حوالے دیے گئے، قواعد و ضوابط کی نزاکتوں کا بیان کیا گیا خلاصہ جن کا یہی تھا کہ صدر صاحب آپ کہاں ان باریکیوں میں پھنس گئے۔ جانے دیں ان معاملات کو یہ ہم جانیں اور یہ لڑکیاں۔ خط و کتابت میں جانے اور کیا ہوتا رہا۔ ماحصل یہی تھا کہ لڑکیوں کے ایس ایم سی میں داخلے کے احکامات جاری نہیں ہوئے۔

پہلے تو وہ چیختی رہیں، چلاتی رہیں کہ یہ کیا اندھیر ہے؟ صدر کے احکامات کی بھی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کوئی شنوائی نہیں

تنگ آمد، بجنگ آمد وہ سندھ ہائیکورٹ جا پہنچیں۔ دو ڈھائی ماہ تک دلائل اور جوابی دلائل کا سلسلہ چلتا رہا پھر ایک دن عدالت نے فیصلہ محفوظ کر لیا جاری کیا گیا تو مدعیان کا نقطہ نظر درست پایا گیا

"حکم دیا جاتا ہے کہ درخواست کنندگان لڑکیوں کو سندھ میڈیکل کالج میں داخلہ دیا جائے"۔

لڑکیاں جیت گئیں، بیوروکریسی ہار گئی، مارشل لاء کھڑا منہ دیکھتا رہا۔

مارشل لاء میں رہتے ہوئے ہمیں کچھ دن جنرل اقبال خاں کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ آج کل وہ جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین ہیں ان دنوں پنجاب سے زون سی کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر کراچی آئے تو خاصا ہراس پھیلا کہ وہ بڑے سخت گیر منتظم ہیں۔ چہرے پر خشونت ہے ماتھے پر شکنیں بقول کسے

ان کی مونچھوں سے چنگاریاں نکلتی ہیں

اب ہماری حالت کا اندازہ لگائیں ذرا، انھیں سندھ کا چارج سنبھالے دو چار دن ہی ہوئے تھے کہ ان کے اے ڈی سی کیپٹن حیدر (اب میجر) کسی کام سے لاہور چلے گئے۔ اور ہمیں عارضی طور پر اے ڈی سی بنا کر جنرل اقبال کے سامنے ڈال دیا گیا اے ڈی سی کی ڈیوٹی بھی ہم نے یوں سنبھالی کہ دفتر پہنچے تو کیپٹن حیدر یکدم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اتنی دیر لگا دی تم نے، میری فلائیٹ کا وقت نکلا جا رہا ہے لو سنبھالو"۔

یہ کہہ کر یہ جا اور وہ جا سنبھالنا کسے تھا جنرل کو یا خود کو۔ وضاحت نہیں کی۔

ہم نے میز کا جائزہ لیا بائیں جانب چار پانچ ٹیلیفون پڑے تھے۔ فائلوں کا ایک ریک (RACK) تھا۔ اور ایک چارٹ پر جنرل کی دن بھر کی مصروفیات کا خاکہ ___ ابھی ہم میز کا جائزہ لینے ہی میں مصروف تھے کہ ایک فون کی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

گھنٹی بجی ___ فون اٹھایا۔

"اقبال سے ملاؤ" تحکم سے بھرپور ایک نسوانی آواز تھی۔

ہم بھی نئے نئے اے ڈی سی بنے تھے نشہ ابھی چڑھا نہیں تھا، اتر کیسے جاتا، نخوت سے پوچھا۔ "کون ہیں محترمہ آپ؟"

"ہٹو بیچ میں سے، اقبال سے ملاؤ" پھر حکم ہوا۔

"محترمہ اقبال جنرل ہے، زون سی کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کالج کا کوئی سٹوڈنٹ نہیں" اقبال سے ملاؤ، ہم نے ان کی نقل اتارتے ہوئے فون پٹخ دیا۔

ٹرن۔ ٹرن رن رن...... ٹرن رن رن.... فون کی گھنٹی پھر بجی وہی محترمہ تھیں۔

"بھئی تم کون ہو کہاں سے آ گئے ہو؟"

"محترمہ میں کیپٹن اشفاق ہوں، جنرل اقبال خاں کا اے ڈی سی"

"اور حیدر کہاں گئے ہیں؟"

انھوں نے پہلے اے ڈی سی کے بارے میں پوچھا۔

"ہیں یہ تو کوئی واقف راز معلوم ہوتی ہیں" ہم نے دل ہی سوچا اور پھر ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ جنرل اقبال خان کی فیملی ابھی تک لاہور میں تھی ڈرتے ڈرتے پوچھا

"آپ لاہور سے تو نہیں بول رہیں"

"اور کہاں سے بول رہی ہوں" ہمیں خاموش ہو جانا چاہیے تھا لیکن احتیاطاً ایک سوال اور کر ڈالا۔ "یعنی آپ ان کے گھر سے بول رہی ہیں؟"

"اچھا؟ تو کہیں اور سے بھی فون آتے رہتے ہیں ان کے؟"

"یا اللہ خیر! گفتگو کی گاڑی یہ کس پٹڑی پر اتر آئی، کوئی حادثہ ہی نہ ہو جائے"۔

ہم نے گھبرائے گھبرائے انھیں ہولڈ کرنے کو کہا اور ریسیور دائیں بائیں کر کے جنرل صاحب کو گھنٹی دی اور بتایا کہ گھر سے فون ہے۔ انھوں نے ٹھہر کرنے کو کہا۔ ہم نے ریسیور کی سمت بدل دی اور فون رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں فون پھر چیخا۔ ہم نے ریسیور اٹھایا

جنرل صاحب پوچھ رہے تھے۔

"کدھر ہے وہ کال جو گھر سے آئی ہے ؟"

"سر! اسی فون پر تھی شاید کٹ گئی میں دوبارہ ملاتا ہوں"۔

بات یہ تھی کہ فون کے لیور کا استعمال ہم پر واضح نہ تھا۔ اسے دائیں بائیں کرنے میں کال کٹ گئی۔ تب ہم نے سگنل کور کے ایک نائیک کو بلایا اس سے فون کا استعمال سمجھا، تب جنرل صاحب کی گھر بات کروائی، خیریت رہی۔

ابھی بمشکل یہ مرحلہ طے کیا تھا کہ پھر کسی فون کی گھنٹی بجی ہم نے ایک فون اٹھایا کوئی نہ تھا، دوسرا اٹھایا، خاموش، تیسرے پر جنرل صاحب ملے۔

"کہاں ہو تم ؟"

"سر سیٹ پر ہوں"۔

"سو رہے ہو سیٹ پر ؟ فون کیوں نہیں اٹھاتے۔؟"

"سر اٹھا تو رہا ہوں ایک طرف سے شروع کیے تھے اٹھانے تیسرے نمبر پر ملے ہیں آپ"۔

" COME IN جنرل نے ڈانٹتے ہوئے اپنے آفس میں بلایا۔

خیال تھا کہ پھرے بیٹھے ہوں گے لیکن انھوں نے نرمی سے پوچھا کہ حیدر بریفنگ دے کر نہیں گیا ؟ جواب نفی میں پا کر وہ زیر لب کچھ بڑبڑاتے پھر بتایا کہ مختصر سی گھنٹی بجے تو میں اس فون پر ہوتا ہوں۔ دو گھنٹیاں بجیں تو اس گرین فون پر اور مسلسل ہو تو اس سفید والے پر۔ ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور واپس آ گئے یہ تو ہوا ہمارے اور جنرل کے درمیان باہمی رابطے کا "مواصلاتی نظام"۔ بیرونی دنیا سے ملانے کے لیے ہمیں اور ٹیلیفونوں کے علاوہ ایک ایسے فون کی سہولت بھی حاصل تھی جس کے دوسرے سرے پر حضرت سلیمانؑ کی سلطنت کا چھوٹا کوئی جن بیٹھا ہوتا تھا۔

"اللہ تعالیٰ نے جنوں کو حضرت سلیمانؑ کے تابع کر رکھا تھا۔ سبا کی ملکہ بلقیس جب حضرت سلیمانؑ سے ملاقات کے لیے آ رہی تھی تو انھوں نے درباریوں سے خطاب کرتے

ہوئے پوچھا:۔

"کوئی ہے جو ملکہ سبا کا تخت جلد از جلد یہاں اٹھا لائے"۔

لکھنے والوں نے اس کا طول و عرض اسی اور چالیس؟ گز بیان کیا ہے۔ خالص جواہرات سے مرصع یہ تخت ملکہ سبا سفر پر روانگی سے پہلے سات تالوں میں بند کرا آئی تھی۔ حضرت سلیمان نے چاہا کہ اس کا تخت اپنے دربار میں حاضر کریں کہ وہ مبہوت رہ جائے۔ اور خدا کا پیغام اس تک پہنچاتے ہوئے وہ برتری بھی حاصل ہو جائے جو بات دل میں اتارنے کے لیے کبھی کبھی ضروری ہوتی ہے۔ ایک جن بولا

"ہاں اس سے پہلے کہ آپ آج کی مجلس برخواست کریں میں تخت حاضر کر سکتا ہوں میں طاقتور بھی ہوں اور امین بھی"۔

حضرت سلیمان بولے نہیں ہمیں اس سے پہلے چاہیے ایک اور ذی علم اٹھا اور ادب سے بولا۔

"آپ فرمائیں تو پلک جھپکتے تخت کو حاضر کر دوں"

تخت حاضر کر دیا گیا

مارشل لاء میں رہتے ہوئے ہم نے دور دراز کے تخت تو نہیں منگوانے ہوتے تھے۔ البتہ سات تالوں میں چھپے ہوئے بیوروکریٹ حضرات کو تلاشنا ہوتا تھا اور کبھی کبھی رات گئے تختوں پر محو خواب شہزادوں کو زحمت بیداری دینا ہوتی تھی۔ اور یہ کام "ساری رانگ نمبر" کے اس دور میں ٹیلیفون کے اس جن کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کسی بھی وقت ریسیور اٹھائیں وہ چوکس ملتا تھا۔ کوئی نمبر اسے دیں پلک جھپکتے ملا دیتا تھا۔ کسی صاحب کا نام لیں، منٹوں، سیکنڈوں میں اسے ڈھونڈ ھ نکالتا تھا۔ اور فون پر حاضر کر دیتا تھا۔

ایک بار ہم نے کسی سیکریٹری سے بات کروانے کو کہا معمول سے تھوڑی تاخیر تو ہوئی لیکن جب وہ بولا تو وجہ تاخیر بھی سمجھ میں آ گئی بولا۔

"مسٹر..... آن دی لائن سر فرام پشاور" (مسٹر..... پشاور سے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

لائن پر حاضر ہیں)

بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف کسی دورے پر پہلے اسلام آباد گئے تھے وہاں سے پشاور چلے گئے ہمارے جن نے اسے وہاں بھی ڈھونڈ نکالا۔

جنرل اقبال کے ساتھ سفر کرنا بڑا کٹھن مرحلہ تھا وہ چلتے چلتے بھی احکام سناتے جاتے تھے۔

"فلاں کو بتانا فلاں کیس کو دس دن سے اوپر ہو گئے۔ جاگنے کی گولیاں بھجواؤں اُسے"۔

ایک تو وہ بولتے بہت آہستہ تھے۔ دوسرے انتہائی مختصر جیسے سلگتی آگ سے کوئی شعلہ بھڑک کر خاموش ہو جائے چلتی گاڑی سے دیکھا کسی زیر تعمیر عمارت کا سیمنٹ ریت، سریا عین سڑک کے بیچ پڑا ٹریفک میں رکاوٹ بن رہا ہے شعلہ بھڑکے گا

"TELL THESE FOOLS TO REMOVE IT FROM THE ROAD"

(ان احمقوں کو بتاؤ کہ اسے سڑک سے ہٹائیں)

کوئی سڑک ٹوٹی ہوئی ہے پگھلے ہوئے گرم کولتار کا بھبکا سا آئے گا

"ASK THEM WHEN IT WILL BE REPAIRED"

(ان سے پوچھو یہ کب تک مرمت ہو گی؟)

کسی سڑک پر گٹر کا پانی جمع ہے حکم آئے گا

MAKE THEM DRINK IT BY THE MORNING IDIOTS

"یہ پانی صبح تک انھیں ہی پلا دو ——— احمق"۔

بعد میں تو خیر ہم ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھتے تھے لیکن پہلا دن یوں گذرا کہ جنرل پچھلی نشست پر بڑبڑاتے رہے ہم اگلی سیٹ پر سیٹ سے سر لگائے آنکھیں موندے رہے۔ ڈرائیور نے ہمیں بے خبر پایا تو آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر ہلایا اور سر کے اشارے سے بتایا کہ جنرل صاحب کچھ کہہ رہے ہیں ہم نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے بھنوؤں کے اشارے سے پوچھا کہ کیا کہہ رہے ہیں؟

اس نے شانے اچکائے، ہونٹ چبائے اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

"اللہ ہی جانے"۔

اب اللہ میاں نے جبرئیلؑ کو تو نازل فرمانا نہیں تھا ہم پر۔ خود ہی ہمت کر کے اسرافیل نما اس جنرل سے پوچھا

"سر آپ نے کچھ کہا؟"

اور جواب میں جیسے صور اسرافیل پھونک دیا گیا ہو۔

"بند کرو یہ مذاق۔ میں جب تم سے مخاطب ہوتا ہوں تم سوئے ہوئے ملتے ہو ڈیوٹی کے وقت آنکھیں کھلی رکھا کرو"۔

اس کے بعد تو یہ حال ہوا کہ سوتے بھی تھے تو ڈیوٹی ہی پر رہتے تھے، کہ عزت کا مسئلہ ہو تو پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کے بستر سے بدل جاتی ہے اور ہمارا تو گزر ہی خاردار راہوں سے تھا۔ سارا دن جنرل کے ساتھ رہتے، شام ڈھلتی تو رہائی کی امید بندھتی لیکن وہ بھی دم توڑ جاتی جب پتہ چلتا کہ رات کو فلاں جگہ تقریب ملاقات ہے فلاں جگہ تقریب عشائیہ۔ چنانچہ وردی اتار خود کو سوٹ میں جکڑ ہم پھر جنرل کے ساتھ نتھی ہو جاتے رات گئے انھیں ان کی رہائش گاہ پر چھوڑتے تو احکامات کی ایک طویل فہرست ہمارے ہاتھ میں ہوتی۔ دفتر آتے، ریسیور اٹھاتے، ٹیلیفون کا جن ڈیوٹی پر موجود ہوتا اس کی مدد سے ہم اس "فلاں" کو جھنجھوڑتے جو "فلاں" کیس پر "غور" ہی فرمائے جا رہا تھا۔ جب اسے بتلاتے کہ صبح آٹھ بجے وہ جنرل سے ملاقات کر کے بتائے کہ اب تک اس نے کیا کیا تو اس کی نیند اڑ جاتی۔ پھر ان "احمقوں" کی تلاش شروع ہوتی جو فلاں روڈ پر عمارت تعمیر فرما رہے تھے۔ انھیں بتایا جاتا کہ کل تک سڑک سے عمارتی سامان ہٹا لیں۔

پھر "فلاں" سڑک پر پانی جمع کرنے والوں کو ڈھونڈھتے۔ بالا افسران تو ٹیلیفون پر مل جاتے اور نیند بھری آواز میں پہلے معروف حربے آزماتے

"یہ میرا کام نہیں آپ فلاں کو بتا دیں"۔ "یہ تو فلاں شعبے کے انڈر آتا ہے"

لیکن جب ہم کہتے کہ اچھا آپ صبح مارشل لاء ہیڈ کوارٹر تشریف لائیں اور ان صاحب کو بھی لیتے آئیں جنرل صاحب فیصلہ کردیں گے کہ کس کا ہے یہ کام؟ تو فوراً فرماتے

"اوہو! اتنے چھوٹے سے کام کے لیے جنرل صاحب کو کیا تکلیف دینی اچھا ہم کرلیں گے آپس میں فیصلہ، ہوجائے گا کام"۔

اس طرح بہت سے "چھوٹے چھوٹے" کام راتوں رات صرف اس لیے ہوجاتے کہ لوگ جنرل اقبال خاں کو "تکلیف" دینا نہیں چاہتے تھے۔ جنرل کو "تکلیف" دینا آسان کام نہیں تھا جو ان کے دفتر سے نکلتا تھا پسینہ پونچھتا ہوا ؎

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا۔

کیپٹن حیدر واپس آئے تو ہم فارغ ہوئے شتابی سے اور سیدھا کور ہیڈ کوارٹر میں آکر دم لیا کہ مارشل لاء میں یہ ہماری آخری ڈیوٹی تھی۔

یہاں کچھ دن لیفٹیننٹ کرنل محمد علی کی رفاقتوں میں رہنے کا موقع ملا۔ مارشل لاء کی ساری تھکن جاتی رہی کہ وہ انگریزی ادب کے غواص ہیں خوبصورت لفظوں کے چمکدار موتی ان کے ہاں آکر نئی آب دیتے ہیں کہ وہ انگریزی کو ہیر کے حوالے سے پڑھنے کے قائل ہیں۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے ہم انگریزی ادب کے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں سے روشناس ہوئے۔ جدید لکھنے والوں کے کتنے ہی ناول پڑھ ڈالے بیشمار لفظ تھے جو ذہن کے گم گشتہ خانوں میں گرد آلود پڑے تھے۔ ان کی جھاڑ پونچھ ہوئی، انھیں نئے معانی ملے، نئے لفظ سیکھے ان کا استعمال دیکھا سمجھا اور یہ سب کچھ ایسے ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں بس بیٹھے بٹھائے کراچی کا ذکر چھڑتا بات چارلس لیمب تک پہنچ جاتی کہ وہ شہر میں رہنے کا رسیا تھا۔ ورڈزورتھ کا دوست تھا لیکن اس کی آوارہ گردیوں پر اس نے کبھی صاد نہ کیا۔ کھیتوں، کھلیانوں اور سنسان سبزہ زاروں میں گھومنے پھرنے کو وہ حماقت قرار دیتا ورڈزورتھ کو سمجھاتا کہ ڈسٹرکٹ لیک (LAKE DISTRICT) کے ویرانوں کو چھوڑ کر یہاں آؤ شہر کی رنگینیوں میں۔ شہروں میں رنگینیاں بھی ہیں اور اقتدار

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کے ایوان بھی۔ لیکن ان ایوانوں میں جعل سازیوں، نفرتوں اور سازشوں کے جو جال بنے جاتے ہیں جو نیتھن سوفنٹ نے انھیں بڑی خوبصورتی سے بے نقاب کیا ہے۔ لوگ بے نقاب ہوجائیں تو ان کے اصلی چہرے بڑے بھیانک نظر آتے ہیں لیکن ایلگزنڈر پوپ کا اپنا ایک سٹائل ہے۔ کنٹربری ٹیلز کے دیباچے میں اس نے مختلف کرداروں کی جو نقشہ کشی کی ہے۔ خوبصورت بھی ہے اور انسانوں کو سمجھنے کے لیے بہترین گائیڈ بھی۔

یوں بات سے بات نکلتی اور ہم بیٹھے بٹھائے صدیوں کے فاصلے طے کرکے پل بھر میں کبھی برنارڈ شا سے ہاتھ ملا آتے کبھی ملٹن سے "ٹسٹ پنجہ" کرآتے کبھی شیکسپئر کے ڈرامے کا کوئی سین دیکھ آتے کبھی ڈاکٹر جانسن سے الجھ آتے۔ کبھی جارج ایلیٹ کی معصوم شرارتوں پر مسکراتے۔ کبھی ٹامس ہارڈی کے کرداروں کو ٹوٹتا پھوٹتا دیکھتے ادب کے سبزہ زاروں میں گھومتے گھامتے اچانک فوجی ماحول میں واپس آجاتے جہاں میس حوالدار ہم سے مخاطب ہوتا۔

"سر! یہ آپ کا بل ہے ٹی بار کا ___ ایک سو پینتیس روپے اکیاون پیسے"

ٹی بار کا بل تو ہم نے دیا سو دیا بعد میں جب کرنل علی کو چھوڑ کر ہم پنڈی آگئے تو ایک سو سنتیس روپے پچاس پیسے کا ایک ڈرافٹ فیس داخلہ امتحانات پنجاب یونیورسٹی کو بھی روانہ کردیا اور انگریزی ادب پر حاوی ہونے کے دعویدار ٹھہرے۔ ارباب اختیار جھانسے میں آگئے۔ اور امتحان کی رسمی کارروائی پوری کرنے کے بعد انھوں نے ہمیں انگریزی ادب میں ماسٹر کی ڈگری عطا فرمادی۔

کرنل علی کو پتہ چلا تو انھوں نے اس ڈگری کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا ان کا کہنا تھا کہ محض گپ شپ کے بل بوتے پر امتحان دینا ڈگری کی توہین ہے اس کے لیے پوری سنجیدگی سے باقاعدہ پڑھائی کرنی چاہیے۔ بس یہیں سے ہمارے ان کے اختلاف کا آغاز ہوتا ہے۔ تھوڑی بہت پڑھائی تو ظاہر ہے ہم نے کی ہی ہوگی۔ لیکن "پوری سنجیدگی سے باقاعدہ پڑھائی" کا رواج؟ کہاں باقی رہ گیا ہے آج کل؟

نشیب و فراز

زندگی نشیب و فراز سے عبارت ہے اس میں سپاٹ رستے بھی ہیں، پر پیچ گھاٹیاں بھی، عزت و اقبال کی بلندیاں بھی ہیں ذلالت و کمینگی کی پستیاں بھی، امارت کی کشادگی ہے غربتوں کی تنگ دستی ۔ دوستوں کی رفاقت ہے، حاسدوں کی عداوت، محبتوں کی نغمگی ہے، نفرتوں کی خشونت، رس بھرے حسین ہونٹوں کی لبھا دینے والی مسکراہٹیں اور جھوٹے وقار کے تکبر کی شکن آلود جبینیں۔

بچپن کی معصومیت ہے، شرارتیں ہیں، بے فکری لاابالی پن، امن، سکون، شانتی گویا کلیوں کی مسکراہٹیں۔ جوانی کی لغزشیں ہیں، جذبات کی لہریں، جسموں کی خوشبو، روٹھنا منانا، خود سپردگی کے لازوال لمحے، اور سمٹ جانے کی کٹھن گھڑیاں، دہکتی ہوئی قربتیں، مہکتی ہوئی تنہائیاں۔ ؎

انھی قربتوں میں پنہاں بڑی دور کے نتائج
جو سمٹ گیا وہ موتی، جو بکھر گیا وہ رائی

زندگی سمٹنے، سنبھلنے اور بکھر جانے کا نام ہے اس کے راستے دلوں کی دھڑکنوں کے قریب سے بھی گذرتے ہیں۔ طاقت کے ایوانوں سے بھی جہاں فرعونیت کا خمار بھی ہے، موسیٰ کا وقار بھی۔ خمار ٹوٹ جاتا ہے، نشہ اتر جاتا ہے وقار سچا ہو، حق پر مبنی ہو تو امتداد زمانہ سے احتشام حاصل کرتا ہے اسے زوال نہیں زوال تو انسان کی عمر کو حاصل ہے کہ زندگی بھر کے تجربے لیے جب بڑھاپے میں داخل ہوتا ہے تو بے کسی کی تصویر بن جاتا ہے۔ یہ زندگی ختم ہوتی ہے تو پھر سے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جس کے بارے میں وعدے ہیں، وعیدیں ہیں، انذار ہے تبشیر ہے۔ کامیاب ہیں وہ لوگ جو اس زندگی میں سرخرو ہیں۔

تبدیلی، تغیر، نیا پن، جدت قدرت کے کارخانے میں ہر طرف کارفرما نظر آتی ہے۔ روشن روشن دن اندھیری رات میں ڈھل جاتا ہے۔ شب کے ٹھنڈے اندھیرے سحر کے خوبصورت اجالوں اور پھر تپتی دوپہروں میں بدل جاتے ہیں۔ گھنیرے درخت خزاں کے ہاتھوں ننگی، لنبی شاخوں میں بدل جاتے ہیں، بہار آتی ہے مسکراتی ہوئی تو پھر سے انھیں نئی خلعتیں عطا کرتی چلی جاتی ہے۔

خالق نے انسان کی فطرت میں بھی تبدیلیوں کی تمنا رکھی ہے۔ تبدیلی اس کی ضرورت ہے چاہے گھاٹے کا ہی سودا کیوں نہ ہو آدم جنت کے پھلوں سے سیر نہ ہوئے، اور گندم کے ایک دانے کے بدلے پوری جنت گروی رکھوا دی۔

قوم موسیٰ آسمانی کھانوں پر مطمئن نہ ہو سکی اور موسیٰؑ کی معرفت خدا سے ان چیزوں کی طالب ہوئی جو زمین اگاتی ہے مثلاً پیاز، کھیرے، ککڑی، دالیں وغیرہ۔

ایک فوجی افسر کی زندگی میں یہ نشیب و فراز ذرا جلد جلد آتے ہیں اس کے ہاں فلم کے مناظر بڑی تیزی سے بدلتے ہیں۔ آج کسی بھرے پرے شہر کے خوبصورت میس میں بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا ہے۔ کل سربلند پہاڑوں کی تنہائیوں میں سرگرداں۔ ابھی کسی صحرا کی خاک چھانتا پھرتا ہے، ابھی حکم ملا فوراً جی ایچ کیو پہنچو۔ اونٹ پر ہچکولے لیتا افسر چند ساعتوں بعد فضا کی وسعتوں میں محو پرواز ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ افسری بڑی چیز ہے لیکن وہی تبدیلی والی بات، کبھی تو کلف لگے کالروں میں سجے سجے گردن اکڑ جاتی ہے چنانچہ اسے تنہا چھوڑنے میں راحت محسوس ہوتی ہے اور کبھی یوں بھی ہوا کہ افسری کا بھرم رکھنے کو ہم نے افسر ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ کہ یہی تقاضائے وقت تھا۔

دسمبر کا مہینہ تھا اور مری کا مقام بلکہ فائز المقام یعنی سکول آف آرمی ایجوکیشن جو مری سے بھی بلند ہے۔ اور اس سے چھ میل پرے اپر ٹوپہ پر واقع ہے۔ ایجوکیشن کور

میں باقاعدہ کمیشن پانے والے افسروں کو بنیادی تربیت تو پی۔ ایم۔ اے ہی میں دی جاتی ہے۔ لیکن شارٹ سروس کمیشن کی تربیت کا اہتمام یہیں ہوتا ہے۔ یہاں تعلیم کے بنیادی کورسوں کے علاوہ نقشہ بینی، تعلقات عامہ، نفسیات اور فوجی جوانوں کے حوصلے بلند رکھنے کے موٹیویشن کورس وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ فوج کے دیگر شعبوں سے متعلق افسروں اور جوانوں کے لیے بھی یہاں کچھ کورس چلائے جاتے ہیں جن کا بنیادی مقصد انھیں اتنی تربیت دینا ہوتا ہے کہ وہ اپنے یونٹوں میں ابتدائی تعلیم کا بندوبست کر سکیں۔ اور بالا ہیڈکوارٹرز سے آنے والی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کا اہتمام کر سکیں۔ یوں سکول آف آرمی ایجوکیشن میں تقریباً ہر آرم اور کور کے افسروں اور جوانوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے ؎

بڑی رونقیں ہیں فقیروں کے ڈیرے

تو صاحبو! دسمبر کا مہینہ تھا اور ہم بطور طالب علم سکول میں "تعلقات عامہ" کے ڈھنگ سیکھ رہے تھے۔ سارا سارا دن بادل چھائے رہتے۔ کثیف دھند کی دبیز تہوں نے ہر چیز کو لپیٹ میں لیا ہوتا۔ پورا علاقہ ہفتوں ڈارک روم بنا رہتا۔ جس میں دن کی روشنی بس اتنی ہی ہوتی جیسے فوٹوگرافر نے کام کرنے کے لیے سیف لائٹ آن کر رکھی ہو کہ کہیں کوئی چمکتی شعاع نظر نہ آتی۔ مدھم مدھم روشنی کے ملگجے اندھیروں میں پٹے لپٹائے فوجی لمبے لمبے ڈگ بھرتے پھرتے۔ کبھی سورج میاں نکلتے بھی تو کپکپاتے ہوئے، لرزتے ہوئے، یوں لگتا جیسے کرنوں کو ٹھنڈے پانی میں غسل دے کر بھیجا گیا ہو۔ کہ ان کی حدت سے زیادہ فضاؤں کی ٹھنڈکیں جسم میں اترتی محسوس ہوتیں۔ ان دنوں فوج کے تمام تعلیمی اداروں میں ہفتے میں دو چھٹیاں ہوا کرتیں۔ یہ رعایت ایک غنیمت تھی کہ قریبی علاقوں کے رہنے والے طلبہ جمعہ کے دن کوچ کر جاتے، نیچے میدانوں میں اترتے، چمکتی شعاعوں کو حیرت سے تکتے، گہرے گہرے سانس لیتے۔ ہفتہ اور اتوار زندگی سے بھرپور مجلسوں میں گزارتے اور اتوار کی شام تک لوٹ آتے۔

ہماری دوڑ پنڈی تک ہوتی، دوستوں سے ملنا ملانا، گپ لگانا، اور اتوار کی شام فیض آباد سے مری کی کسی بس میں بیٹھ جانا، میجر انور شفیق خالد اور میجر معین قریشی ہمارے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ساتھی طالب علم تھے۔ دونوں چھٹیاں گزارنے کھاریاں اور منگلا جایا کرتے۔ اکثر ان سے یہیں فیض آباد پر ملاقات ہو جاتی۔ مری سے لے کر جھیکا گلی تک تو کوئی بس یا ٹیکسی وغیرہ مل جایا کرتی۔ آگے تین میل کا فاصلہ خوش گپیوں میں پیدل ہی کٹ جاتا۔ کبھی کبھار دیر ہو جاتی تو مری سے جھیکا گلی تک بھی پیدل ہی لڑھکنا پڑتا۔ کوئی ساتھ ہو تو یہ فاصلہ مختصر دکھائی دیتا ہے لیکن رات کے اندھیروں میں تنہا آدمی یہ سفر کرے تو یہ مختصر سا فاصلہ دشت کی سیاہیوں اور صحراؤں کی وسعتوں میں بدل جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے شب کی سیاہیوں میں مزید کالک گھول کر انھیں پہاڑیوں پر الٹ دیا گیا ہو۔ تنہائیوں میں آہٹوں کے اسرار بھی بڑھ جاتے ہیں اور راہوں کے فاصلے بھی۔ ہر موڑ کے بارے میں دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے کہ یہ آخری موڑ ہو۔ لیکن یہ دعائیں کبھی نہیں سنی جاتیں۔ قدموں کی چاپ گھوڑوں کی ٹاپوں کی طرح گونجتی ہے۔ ہر قدم پر اندھیرے ماحول سے کسی لال دیو یا سر کٹے جن کے ظہور کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ جھیکا گلی سے آگے کی سڑک پر درختوں کی اتنی بہتات ہے۔ اور جنگل اتنا گھنا ہے کہ واقعی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔

تاروں بھری رات ہو تو اس کا اجالا جھیکا گلی تک تو ساتھ دیتا ہے۔ لیکن اس کے آگے بس یوں لگتا ہے جیسے کوئی اندھی سرنگ ـــــ سڑک مسلسل بل کھاتی ہے اور برسات کی راتوں میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اٹھا ہوا قدم سڑک ہی پر اترے گا یا کسی گہرے کھڈ کے کنارے پر ـــــ آنکھیں جھپک جھپک کر یا دائیں پہاڑ کی دیوار ٹٹول ٹٹول کر راستہ متعین کرنا پڑتا ہے۔ ہم کئی بار لیٹ ہوئے اور کئی بار ان راہوں سے آدھی آدھی رات کی تنہائیوں میں گزرنا پڑا ـــــ ہر بار ہم نے قسم کھائی کہ آئندہ شام ڈھلے لوٹ آیا کریں گے۔ لیکن فوجی چھٹی گیا ہو تو نہ چاہتے ہوئے بھی لیٹ ہو جایا کرتا ہے۔

لیکن ایک بار ایسے لیٹ ہوئے کہ خاصے لیٹ ہو گئے۔ شامتِ اعمال شام کا کوئی شو دیکھنے کسی سینما ہال میں گھس گئے درمیان میں بجلی غائب ہو گئی اور یوں ساڑھے نو کا شو ساڑھے دس بجے ٹوٹا۔ ہم سیدھے فیض آباد پہنچے لیکن مری کی بس اب آتی ہے

نہ تب۔ کافی دیر انتظار کے بعد پیر ودہائی کے بس سٹینڈ جا پہنچے، پتہ چلا مری کی سب بسیں جا چکیں ایک بس کھڑی ہے صبح چلے گی چھ سات بجے۔ اور ہمیں ٹھیک آٹھ بجے کلاس روم میں ہونا چاہیے تھا۔ الجھی الجھی سوچوں کے ساتھ بس کا طواف کیا تو دو چار اور بھی فکرمند چہرے دکھائی دیے۔ چہروں مہروں اور چال ڈھال سے فوجی لگتے تھے —— مری کے مضافاتی علاقوں میں سکول آف آرمی ایجوکیشن کے علاوہ اور بھی فوجی ادارے ہیں۔ سب کا درد مشترک دکھائی دیا۔

کنڈکٹر سے بات کی کہ کیوں نہ ابھی چلا جائے یہ چار چھ سواریاں تو ہیں کچھ اور مل جائیں گی۔ پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا لیکن اصرار پر بولا

"مجھے کم از کم ڈیڑھ سو روپیہ چاہیے مری جانے کا، آپ چھ آدمی یہ رقم پوری کر دیں میں ابھی چلتا ہوں"

ہم نے جیبیں ٹٹولیں کل کائنات چھ سات روپوں پر مشتمل تھی۔ (مہینے کی آخری تاریخیں ہوں اور فوجی کا چھٹی سے لوٹنے کا وقت تو وہ یوں ہی پھانک ہوا کرتا ہے) ہم نے بے بسی سے کنڈکٹر کی طرف دیکھا پھر باقی امیدواروں کو۔ انھوں نے بتایا کہ دو چار اور لوگ بھی جانے والے ہیں لیکن بس نہ جانے کی وجہ سے ابھی واپس گئے ہیں۔ ہم نے لمحہ بھر کو سوچا اور ڈیڑھ سو روپے پر کنڈکٹر سے بس کا ٹھیکہ لے لیا۔ دو چار آدمیوں کو دوڑایا کہ پلٹتی ہوئی سواریوں کو واپس لائیں۔ ڈرائیور سے کہا کہ بس کو اندھیرے سے نکال کر ذرا روشنی میں کھڑا کرے۔ جاتی ہوئی سواریاں واپس آئیں۔ کل دس ہو گئیں۔ ہم نے بس کے اندران سب کا ہنگامی اجلاس طلب کیا تھوڑی دیر کے بعد ہم خود پائیدان پر کھڑے تھے اور باقی بس کے چاروں اطراف دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔

"مری —— مری —— مری —— مری"

آہستہ آہستہ لوگ آنے شروع ہوئے۔ زیادہ عمر کے لوگوں کو بٹھا دیا جاتا صحتمند سواریوں کو مزید سواریوں کی تلاش پر لگا دیا جاتا۔ پیر ودھائی کے اڈے سے مری کیلیے ایسی بس کب روانہ ہوئی ہو گی کہ دو درجن سے زائد کنڈکٹر پورے اڈے پر "مری، مری" کی

دہائی دے رہے ہوں۔ کچھ منچلے تو ہوٹلوں تک جا پہنچے

"ہے کوئی مری دی سواری، بس چلی اے"

"مری ۔ مری ۔ مری"

مری کے مسافر جو بس نہ پا کر رات بھر کو مقیم ہوا چاہتے تھے پھر پا بہ رکاب ہو گئے۔ ایک جگہ ہاتھا پائی کی نوبت بھی آئی کہ مری کی بس ہوٹل والوں کی روزی پر "ٹائر" مار کر جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں پوری بس بھر گئی ہم نے ڈرائیور سے چلنے کو کہا وہ ایک کونے میں اصلی کنڈکٹر سے سرگوشیوں میں مصروف تھا۔ معلوم ہوا بھری بس کو دیکھ کر ان کی نیت خراب ہو رہی تھی اور وہ ٹھیکہ منسوخ کر کے بس کو اپنے ڈھب سے چلانا چاہتے تھے یعنی ایک تو وہی ٹھونسم ٹھونس، دوسرے جگہ جگہ رکنا۔ سواری ملے نہ ملے چیخنا چلانا۔ گویا دو گھنٹوں کی جگہ انھوں نے چار گھنٹے لگا دینے تھے۔

ہم نے ان کے ارادے بدلتے دیکھے تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ایک دو "عارضی کنڈکٹر" تو دفعہ تین سو دو کے پریکٹیکل پر تل گئے اور اچھے خاصے وزنی پتھر اٹھا کر ڈرائیور پر چڑھ دوڑے، ایک نے بس کی چابیاں چھین لیں اور سٹیئرنگ سنبھال لیا۔ اصلی ڈرائیور اور کنڈکٹر نے "غنڈہ گردی" کا یہ سماں دیکھا تو چپ چاپ "شرافت" پر اتر آئے ڈرائیور نے سیٹ سنبھالی، کنڈکٹر اس کے قریب ہی دبک گیا۔ اور بس روانہ ہو گئی۔ گرچہ ڈرائیور کو ہدایت تھی کہ کریٹ سے پہلے کہیں نہ رکے لیکن وہ عادت سے مجبور تھا، جہاں کوئی ہاتھ دیتا، رک جاتا، ہم سواریاں چڑھاتے، چھٹ مقپ بٹھاتے اور ہانک لگاتے

"جان دیوس" (جانے دو)

اب مسئلہ تھا ٹکٹوں کے پیسوں کی وصولی کا۔ سواریاں زیادہ ہو گئی تھیں۔ اور ٹھیکے کی رقم پر تقسیم ہونے سے ایک ٹکٹ کی اوسط معمول سے کچھ کم ہی آتی تھی ہم نے اس اوسط کا بھری بس میں اعلان کیا اور سواریوں کو ٹکٹوں کے پیسے نکالنے کی ہدایت کی۔ کنڈکٹر نے کھا جانے والی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ پیسے وصول کرنے شروع کیے تو

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ایک اور مسئلہ درپیش ہوا کچھ سواریاں راستے کی بھی تھیں اور جو سواریاں ڈرائیور جگہ جگہ روک کر بٹھا رہا تھا۔ انھوں نے بھی پورا کرایہ نہیں دینا تھا خاصے لطیفے ہوئے جو آدمی جو کچھ دیتا ہم رکھ لیتے کوئی ہم سے پوچھ بیٹھتا

"کتنے پیسے؟"

ہم زیادہ طلب کر بیٹھتے تو وہ یکدم آگ بگولہ ہوجاتا کہ یہ کرایے کب سے بڑھ گئے ہیں؟ کسی نے طنز کی

"نواں نواں کنڈکٹر لگنا ایں" (نئے نئے کنڈکٹر لگتے ہو)

اب ہم سب کے سامنے تو اپنی داستان دہرانے سے رہے خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ پیسوں کی وصولی کے بعد انھیں گنا وہ ڈیڑھ سو روپے سے دو چار زائد ہی تھے۔ ہم نے پیسے جیب میں ڈالے اور ایک سیٹ پر دراز ہوگئے اس کے بعد ڈرائیور نے ایک دو سواریاں اور بٹھائیں اور کنڈکٹر نے اشارہ بھی کیا کہ ان سے پیسے وصول کیے جائیں لیکن ہم نے بتایا کہ پیسے پورے ہوگئے ہیں باقی سواریاں مفت جائیں گی فی سبیل اللہ — اس کے بعد ڈرائیور نے بریک نہیں لگائی۔

صبح ہم ہشاش بشاش اپنے کلاس روم میں موجود تھے۔ چائے کے وقفے میں کلاس روم سے نکل کر اوپر جا رہے تھے کہ سامنے سے جوانوں کی ایک پلاٹون آتی دکھائی دی۔

این سی او نے کاشن دیا۔

"دائیں سلام"۔

سب کی گردنیں ہماری طرف مڑ گئیں تب ہم نے حیرت بھری ایک آواز سنی۔

"اوئے۔ ایہہ صاب تے رات والا کنڈکٹر نہیں؟"

(یہ صاحب رات والا کنڈکٹر نہیں؟)

لیکن اس وقت ہم افسری کے روپ میں واپس آچکے تھے۔ کلف لگی وردی زیب تن تھی۔ ہم نے ببانگ دہل ڈانٹ پلائی۔

"نوٹاکنگ آن پریڈ۔ لُک فرنٹ"۔

(NO TALKING ON PARAD' LOOK FRONT)

تا سامنے دیکھ"

جوانوں نے سامنے دیکھنا شروع کردیا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ سنایا جائے آپ کو۔

جنرل اے اے کے نیازی ایک دور میں لاہور کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے اور ہم "طالب علم رہنما" ان کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور کافی عرصہ پسِ دیوارِ زنداں بھی رہنا پڑا۔ لیکن۔

تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

"یہ تو دن ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں" (القرآن)

وہ وقت بھی آیا جب جنرل نیازی سیاستدان تھے اور ہم "مارشل لاء حکام" ایک بار اوپر سے حکم ملا کہ

"جنرل صاحب کو فوراً گرفتار کرلو"۔

وہ اس وقت کراچی کے ہوائی اڈے سے پرواز کیا ہی چاہتے تھے۔ ہم احکام کی وصولی کے وقت سندھ اسمبلی بلڈنگ میں بیٹھے تھے۔ آندھی کی طرح ائرپورٹ پہنچے، بڑے ادب سے سلیوٹ کیا اور نہایت احترام سے انھیں "زیرِ حفاظت" لے لیا۔ اس واقعہ کی تفصیل پھر کسی موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس وقت تو موضوع کے اعتبار سے ان کے تحمل، رواداری اور فراخ دلی کا ایک واقعہ دہرانا مقصود ہے آرٹلری کے کیپٹن اختر اقبال اس واقعے کے راوی ہیں۔

جنرل اے اے کے نیازی ایک بار میانوالی کے روایتی لباس، گھیرے دار شلوار، کرتے اور واسکٹ میں ملبوس کوئٹہ سے ملتان جا رہے تھے۔ نکلتا ہوا قد، اور اس پر یہ لمبے طرّے والی پگڑی۔ ان کے ساتھ والی نشست ایک کیپٹن خالد اکبر چوہدری کے حصے میں آئی جس نے اس سے پہلے جنرل نیازی کو نہیں دیکھا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کپتان بنیادی طور پر چوہدری تھا۔ اسے کسی اور کے سر پر یہ لمبا طرہ بھلا کیسے دکھائی دیتا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

وہ ابھی اپنے پڑوسی کے شملے کی لمبائی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ ائر ہوسٹس مسکراہٹیں بکھیرتی آئی۔ کپتان نے انگریزی کا اخبار طلب کیا۔ اور بڑی بے نیازی سے پڑھنے لگا۔ جنرل نیازی نے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں کہا۔

"کی خبراں نیں، وت سانوں وی سنا دیو کوئی خبر شبر"۔

(کیا خبریں ہیں، ہمیں بھی کوئی خبر دبر سنا دو)

کپتان صاحب تو پہلے ہی انھیں نیچا دکھانے کی سوچ میں گُم تھے انھیں احسان کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ ترجمہ کر کر کے خبریں سنانے لگے۔ خبروں کے بعد باری گپ شپ کی آئی۔ تعارف ہوا تو کیپٹن نے بڑے فخر سے بتایا

"ہوں تو میں بھی چوہدری لیکن جہالت بھرے گاؤں میں کلف لگی پگڑیاں پہن کر غریب مزارعوں پر رعب ڈالتے پھرنا مجھے قطعاً اچھا نہیں لگتا۔ بازوؤں میں زور ہے اس لیے فوج کا انتخاب کیا ہے"۔

"بے چارے زمیندار" نے کپتان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور مزید تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"تہاڈی گل ٹھیک اے چار پیسے تے ہوندے نے ساڈے کول پر تہاڈی جیہیاں ٹوراں تے نئیں ناں"۔

(آپ کی بات درست ہے ہمارے پاس چار پیسے تو ہوتے ہیں لیکن آپ جیسی آن بان تو نہیں نا)

کپتان نے زمیندار کو متاثر ہوتے دیکھا تو رہی سہی کسر بھی پوری کرنے پر تُل گئے انھوں نے فوج کی نوکری کی اتنی شاندار نقشہ کشی کی کہ "زمیندار" کی آنکھیں حیرت سے پھیلی رہ گئیں۔

"چار چار پانچ پانچ خادم تو ہر وقت سرنگوں رہتے ہیں ایک کپتان کے سامنے اس کے ایک اشارے پر پوری بٹالین دہل کر رہ جاتی ہے۔ کرنل، جنرل تو اپنے دفتروں میں بند ہوتے ہیں اصل کمان تو کپتانوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ میس ایسے ہوتے

ہیں جیسے بلوریں شیشوں کا حجلۂ عروسی۔ کپتان کیا ہوتا ہے پرستان کا شہزادہ سمجھ لو بس"

"اچھا کپتان کی یہ عیاشیاں ہوتی ہیں تو جنرل کا کیا حال ہوتا ہوگا"؟ جنرل نے دریافت کیا۔

ناں جی ناں! بات یہ ہے کہ ہمارے جنرل وہ ہیں جن کی تربیت انگریزوں کے ہاتھوں ہوئی۔ انھیں کیا معلوم کہ آزاد قوم کے افسر کیا ہوتے ہیں؟

اس کے بعد انھوں نے نام لے لے کر مختلف جنرلوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ جن میں جنرل نیازی بھی شامل تھے۔ جنرل صاحب بغور ان کے ارشاداتِ عالیہ سے مستفید ہوتے رہے۔ مسکراتے رہے، لقمہ دیتے رہے اور کرید کرید کر کپتانوں کی "عیاشیوں" اور جنرلوں کی "بدمعاشیوں" کے قصے سنتے رہے۔

ملتان ہوائی اڈے پر اُترے۔ کپتان صاحب اور جنرل ایک ساتھ جہاز سے باہر آئے۔ کپتان نے بکمالِ مہربانی "زمیندار" کو پیشکش کی کہ انھیں لینے کے لیے کوئی نہ کوئی گاڑی ضرور آئی ہوگی۔ اگر وہ چاہیں تو انھیں لفٹ دے دیں گے۔ زمیندار نے بڑے اخلاص سے شکریہ ادا کیا۔ اسی دوران پسنجر لاؤنج آ گیا وہاں ایم پی کے کچھ سپاہی کھڑے تھے جنھوں نے ایڑیاں بجا کر بڑی پھرتی سے سلیوٹ کیا کپتان صاحب نے ادھر ادھر دیکھا دور د نزدیک کوئی اور افسر نظر نہ آیا۔ سوچا شاید انھیں ان کی ہیرکٹ سے پہچان کر سلیوٹ کیا گیا ہے۔ اک شانِ دلربائی سے گردن کو خم دے کر جواب دیا اور داد طلب نظروں سے "زمیندار" کی طرف دیکھا جو گردن کے معمولی جھٹکے اور آنکھوں کے اشارے سے کپتان کی ٹھاٹھ باٹھ کی داد دے رہا تھا۔ اس کے بعد کپتان صاحب نے زمیندار کو ہدایت کی کہ وہ اپنا سامان لیکر وہیں کھڑے رہیں وہ باہر جا کر ذرا گاڑی دیکھ آئیں۔

باہر نکل کر دیکھا تو تین ستاروں والی شیورلیٹ گاڑی چمک رہی ہے۔ کسی سے پوچھا یہ کس کی گاڑی ہے؟

بتایا گیا جنرل عبداللہ خان نیازی کی جو اسی فلائیٹ سے پہنچے ہیں پھر بتانے والے نے کپتان صاحب کو بتایا کہ ابھی تو آپ ان سے باتیں کر رہے تھے کھڑے ہوئے۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

یعنی وہ شلوار قمیص اور پگڑی والا شخص جنرل ہے؟

"جی ہاں! آپ کیا سمجھتے رہے ان کو؟"

"میں ـــــ میں ـــــــــــ مارے گئے"

کپتان صاحب نے اپنی گاڑی کو بھی نہ تلاشا، سامنے کھڑی ٹیکسی پکڑی اور ائرپورٹ سے فرار ہو گئے۔

کیپٹن افتخار آج کل ہمارے روم میٹ ہیں انھوں نے بھی اسی قسم کا ایک واقعہ سنایا وہ آرٹلری سے متعلق ہیں ایک بار کورس کرنے کے لیے سکول آف آرٹلری نوشہرہ آئے ہوئے تھے۔ راولپنڈی سے متعلق ہیں ہر ویک اینڈ پر گھر آجاتے اور چھٹی کے اختتام پر نوشہرہ روانہ ہو جاتے۔ ایک بار واپس جا رہے تھے۔ بس کا سفر تھا ساتھ والی نشست پر ایک فوجی براجمان تھا اس نے گفتگو کا آغاز کیا

"کی کم کردے او تسی"؟ (آپ کیا کام کرتے ہیں؟)

"بس یار فوج دا راشن لکھیا اے مقدراں وچہ"۔ (بس یار فوج کا راشن مقدر میں لکھا ہوا ہے)

کتنی نوکری ہو گئی"؟

"یہی کوئی ڈیڑھ دو سال"۔

فوجی نے فوراً اندازہ لگایا کہ اگر نوکری صرف ڈیڑھ یا دو سال ہے تو پھر تو یہ جوان ہو گا سیدھا سادا، اور اس ناطے وہ خود چونکہ نائیک تھا اس لیے سینئر تھا اس نے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کرنا شروع کر دیا۔ لانگری سے تعلقات مستحکم کرنے کے فوائد، حوالدار میجر کی نظروں سے دور رہنے کی تدابیر، یونٹ میں کام بڑھ جائے تو خود کو بیمار کرنے کے گُر، بخار چڑھانے کے ٹوٹکے، نزلہ زکام میں مبتلا ہونے کے چٹکلے، چھٹی لینے کے طریقے، افسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مواقع، کسی ورکنگ پارٹی میں ہوتے ہوئے کام نہ کرنے کے ہنر، اجتماعی تربیت کے موقعوں پر خود کو ریر ہیڈ کوارٹر میں بھجوانے کے نسخے اور ٹریننگ کے لیے یونٹ کے ساتھ باہر جانا ہی پڑ جائے تو بھوک اور پیاس کی صورت میں بالا کمانڈروں کی آنکھ بچا کر گاؤں کے بچوں بالوں سے رابطہ قائم کرنے، لسی اور مکئی کی روٹیاں اور ساگ منگوانے کے طریقے وغیرہ وغیرہ۔ تجربات کا نچوڑ بیان کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ "معزز سامعین" کا حال بھی دریافت کیا جائے۔

"تم کیا کرتے ہو؟"

کیپٹن افتخار نے بتایا:۔

"میں ایک افسر کا اردلی ہوں، افسر بڑا سخت اور اکھڑ مزاج ہے کہتا ہے صبح ذرا جلدی جگا دینا ـــــ صبح سویرے جگا دوں تو ناراض ہوتا ہے کہ نیند کا ستیاناس مار دیا، نہ جگاؤں تو ڈانٹتا ہے کہ آفس سے لیٹ کروا دیا، سادہ قمیض نکال کر دوں تو کہتا ہے دھاری دار قمیض نکال کر دو، دھاری دار نکال کر رکھوں تو سادہ قمیض مانگتا ہے کبھی سر شام سو جاتا ہے آدھی رات کو اٹھ کر شور مچاتا ہے میرا کھانا لاؤ، کبھی رات گئے تک آوارہ گردیاں کرتا رہتا ہے۔ میں اس کے انتظار میں سوکھتا رہتا ہوں، زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے"۔

تجربہ کار نائیک نے افسر سے جان چھڑانے کے نسخے بتائے:۔

"صبح اپنی نیند پوری کیا کرو۔ افسر کچھ پوچھا کرے تو صاف کہہ دیا کرو، جاگ نہیں آئی۔ وردی تیار کرتے ہوئے بھول اُلٹے لگایا کرو قمیصوں، پتلونوں کے بٹن توڑ دیا کرو، ایک آدھا اچھی سی پتلون دھوتے ہوئے ستیاناس کر دو کسی خوبصورت سے سوٹ کا کوٹ پانی میں دھو ڈالو، جرابیں اور رومال گم کرنا شروع کر دو، پیسے لاپرواہی سے خرچ کرو۔ بازار سے چیزیں گھٹیا اور مہنگی لایا کرو، چند دن تک ڈانٹ تو پڑے گی لیکن یقیناً تبدیل کر دیے جاؤ گے"۔

سعادت مند افتخار نے تحسین بھری نظروں سے استاد کی طرف دیکھا اور وعدہ کیا کہ وہ ان تدابیر پر عمل کرتے ہوئے اپنے افسر سے جان چھڑانے کی پوری کوشش

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کرے گا۔

نوشہرہ آیا، استاد نے جوان کو دعوت دی کہ وہ کبھی اس سے ملنے اس کے یونٹ آئے۔

جوان نے مسکین صورت بنا کر کہا

"جب تک میں بیٹ مین ہوں، کہاں نکل سکتا ہوں جی یونٹ لائن سے، آپ ہی تکلیف کیجیے گا کسی وقت"

استاد نے بڑی شفقتوں سے دم دلاسے دے کر جوان کو رخصت کیا اور دمِ رخصت نصیحتوں پر عمل کرنے کی تاکید بھی۔

یونیورسٹی لائف کا دوسرا جنم

صاحبو!

امیر خسرو کا شاید ایک ہی دوست تھا جو ترک تھا ان کا دوست لاکھ کہتا ؎

ہے ہجر کی لمبی رات بڑی، سنجوگ کی تو بس ایک گھڑی
جو دل میں ہے لب پہ آنے دو شرمانا کیا، گھبرانا کیا

لیکن زبان رکاوٹ بن جاتی اور محض اشاروں کنایوں پر گزارا کرنا پڑتا۔ ظاہر ہے جب پیار کی بات چل نکلتی ہے تو محض اشارے کافی نہیں ہوتے جذبات کا بھرپور اظہار بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ دل کی دھڑکنوں کو اذنِ تکلّم نہ ملے تو انسان جیتے جی مر جائے، مٹ جائے غالباً اسی کیفیت سے گزر کر امیر خسرو نے کہا تھا ؎

چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من
زبانِ یارِ من ترکی، و من ترکی نمی دانم

(کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس کی زبان میری زبان میں ہوتی میں اس کی زبان بول سکتا کہ میرے یار کی زبان تُرکی ہے اور مجھے ترکی آتی نہیں)

شاعر نے وہ حالات تفصیل سے بیان نہیں کیے کہ یہاں کا "طوطیِ ہند" کہلانے کے باوجود آخر ایک تُرک سے دوستی پروان چڑھانے کی تک کیا تھی۔ لیکن تاریخ کے سرسری مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ترکوں نے اس دور میں یہاں کافی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ ایک شاہ دل شاعر نے حاتم طائی کی روح کو بے چین کرنے کے لیے ایک ترک دوشیزہ کے بارے ہی میں فرمایا تھا۔ ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آور دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

صاحبو! ہماری حالت کا تصور تو کیجیے کہ مارشل لاء سے چھوٹے تو ترکوں میں گھر گئے۔ اور تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ کراچی سے ہماری پوسٹنگ دوبارہ راولپنڈی ہوئی۔ آئی ایس پی آر میں یہاں چند مہینے ہی گزرے تھے کہ جی ایچ کیو سے ایک سوالنامہ ہمارے نام آیا پوچھا گیا تھا کہ اگر سہولتیں مہیا کی جائیں تو کون سی زبان سیکھنا پسند کرو۔ ترتیب سے بیان کرو۔ ہم نے لکھ بھیجا کہ اولیت تو ہم عربی کو دیں گے کہ تھوڑی بہت شدبد حاصل تھی۔ اس میں نشستیں کم ہوں تو فرانسیسی پڑھوا دیں کہ انگریزی سے ملاپ کے بعد ہم یورپ میں امن کے بڑے کامیاب سفیر بن سکتے ہیں اور یہ بھی نہ ہو سکے تو روسی زبان ہی سہی۔ شاید کہ کبھی پڑوسیوں سے مذاکرات میں کام آئے۔ ہماری اس خواہش کا اظہار ہونا تھا کہ ہمارے شمالی پڑوسی ہمارے قریب سرک آئے اور جب سے خواہ مخواہ دروازہ پیٹ رہے ہیں انھیں خبر پہنچے کہ ہم روسی زبان نہیں پڑھ سکے ہمیں معاف رکھا جائے۔

سوالنامے کے جواب میں ایک دن ہمیں جی ایچ کیو طلب کیا گیا۔ ایک جنرل کی سربراہی میں ایک لمبا چوڑا بورڈ بہت سے افسروں سے پوچھ گچھ میں مصروف تھا ہماری باری آئی۔ چند بے ضرر سے سوالات جنرل نالج سے متعلق۔ عرب کا جغرافیہ وغیرہ وغیرہ۔

بہت سے سوالوں کے بعد ایک ماہر لسانیات نے سوال داغا

"صاحب یہ بتائیے مِنضَوَۃ" کا کیا مطلب ہے؟

"جی معلوم نہیں"۔

"کیوں"

"نہ جاننے کے لیے کسی جواز کا ہونا ضروری ہے کیا؟"

"لیکن آپ نے لکھا ہے کہ آپ عربی پڑھنا چاہتے ہیں"۔

"اسی لیے لکھا ہے کہ عربی جانتے نہیں ہیں جانتے ہوتے تو کوئی اور زبان سیکھنا چاہتے"۔

بورڈ کے ارکان قائل ہو گئے ہمیں عربی زبان سکھلانے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اور بہت سے دوسرے افسروں کے ہمراہ اسلام آباد میں نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگوئجز (قومی ادارہ برائے زبانہائے جدید) بھیج دیا گیا۔

اس ادارے کا محلِ وقوع ہم آپ کو سمجھائے دیتے ہیں۔ اسلام آباد کی نئی ریلوے لائن کا آخری سٹیشن ہے مارگلہ اس کے قریب ہی یہ ادارہ قائم ہے سی ڈی اے والوں نے اس جگہ کو سیکٹر ایچ ۹ (۹ - H) قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے جب سے میجر ضمیر جعفری نے سی ڈی اے کو خیر باد کہا، اس پر ریاضی دانوں یا دفتری بابوؤں کا تسلط ہے کہ نئی بستی بسنے پر اسے یوں ایک نمبر الاٹ کرتے ہیں جیسے کسی فائل میں نئی مسل کا اضافہ ہونے پر اُسے فلیگ کر دیا جاتا ہے۔ نئی مسل لف ہذا ہے بر صفحہ ۲۴۵، ضمیمہ الف رہائشی منصوبوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوششیں بجا لیکن بستیاں ایک تو بستے بستے بستی ہیں دوسرے دھڑکتے دل والے انسانوں سے بے جان فائلوں کا سا سلوک ویسے بھی ظالمانہ سا، آمرانہ سا لگتا ہے۔

شروع شروع میں جو نام یہاں رکھے گئے ان میں کچھ نغمگی، جمالیاتی و صوتی ہم آہنگی موجود تھی۔ جیسے آب پارہ، دامنِ کوہ، چنبیلی باغ وغیرہ وغیرہ لیکن اب تو نمبروں کی اتنی بھرمار ہے کہ صحیح پتے پر پہنچنے کے لیے حساب دانی کے ساتھ ساتھ الجبرا اور جیومیٹری میں بھی تھوڑی بہت شدبد ضروری ہے۔ ورنہ ہو گا یہی کہ نکلیں گے آپ منشاء یاد کی تلاش میں الیف سکس کی گردان کرتے ہوئے اور اپنی دانست میں جب داخل ہوں گے سی ڈی اے کے مطلوبہ دفتر میں تو فائلوں کے ڈھیر کے پیچھے سے طلوع ہوں گے جناب ضمیر جعفری یہ بتاتے ہوئے کہ یہ تو نیشنل سنٹرز کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

بات ہو رہی تھی جدید زبانوں کے قومی ادارے کی۔ یہ بہت سی تہذیبوں کا سنگم بھی ہے۔ کہ ہر زبان پڑھانے کے لیے اہلِ زبان میسر ہیں اور سول اور ملٹری تعلقا

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

حسین امتزاج بھی کہ رنگ برنگے ملبوسات کے ساتھ ساتھ ایک سے رنگ کی وردیاں بھی اپنی بہار دکھلاتی ہیں۔

انسٹیٹیوٹ کی تمام تر آبادی اس کی بسوں کی مرہونِ منت ہے یہ نیلی نیلی خوبصورت سی بسیں منہ اندھیرے شہر کے گوشوں سے طلبہ و طالبات کو اکٹھا کرکے صبح سویرے یہاں پہنچا دیتی ہیں۔ اور خود ایک کونے میں کھڑے ہو کر چھٹی کا انتظار کرتی ہیں کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ مسلح افواج کے طلبہ کی بسیں خراب ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ چلاتے، ڈکراتے ٹرک لے لیتے ہیں جو ادارے کی باقی بسوں کے ساتھ یوں لگتے ہیں جیسے چھوٹی نسل کی ننھی منی بکریوں کے درمیان کوئی ڈراتا بھناتا بھینسا گھس آیا ہو۔

انسٹیٹیوٹ دو عمارتوں پر مشتمل ہے رنگت کے اعتبار سے ایک سرخ ہے دوسری سفید۔ طلبہ میں سرخ عمارت ریڈ فورٹ (RED FORT) کے نام سے موسوم ہے۔ اور سفید عمارت وہائیٹ ہاؤس کہلاتی ہے دونوں عمارتوں میں ایک ایک کنٹین بھی واقع ہے۔ جس کے ٹھیکیداروں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ طلبہ کو گرمیوں میں ٹھنڈے مشروبات اور سردیوں میں گرم چائے نہ مل پائے۔ کھانے پینے کی باقی اشیاء میں اب تو کچھ ورائٹی آگئی ہے ورنہ ماضی قریب تک تو وہاں صرف سموسے ملتے تھے جن کا سب سے زیادہ نقصان طلبہ کو ہوتا تھا طالبات اس سے مستثنیٰ ہیں کہ انھیں پرس کی سہولتیں حاصل ہیں جو میک اپ کے سامان کے علاوہ سینڈوچز رکھنے کے کام بھی آتا ہے اس کا یہ استعمال ہم نے کثرت سے یہیں دیکھا کہ نصف النہار کے وقت جب مسلسل پڑھائی کی وجہ سے سر چکرانے لگتے ہیں تو آدھ گھنٹے کا وقفہ ہونے پر طالبات ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ پرس کھولتی ہیں، للچا دینے والے لذیذ سینڈوچز نکالتی ہیں اور کینٹین سے بوتل لیے دبی دبی مسکراہٹوں کے ساتھ قریبی کمروں میں گم ہو جاتی ہیں طلبہ حیران، پریشان روزانہ نئی چیزوں کی آس لیے کینٹین کی طرف بڑھتے ہیں تو حسب معمول سموسوں کا ایک تھال ان کا منتظر ہوتا ہے سروں کو تھامے جب طلبہ ان سموسوں کو گھور رہے ہوتے ہیں، تو

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

ان کے ارد گرد مسکراہٹوں کے ساتھ ساتھ سینڈوچز کے تبادلے بھی ہو رہے ہوتے ہیں ؎

ہنستا جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگوئجز کا نیا نام گویا یونیورسٹی لائف کا دوسرا جنم تھا۔ وہی کتابوں کے ساتھ ساتھ کتابی چہرے، امتحانوں کا خوف، ایمان کا خطرہ، شرارتیں، مسکراہٹیں، قہقہے، بے باک نظریں بھی، حیا بار نگاہیں بھی، حماقتوں کے پتلے بھی، شرافتوں کے مجسمے بھی۔ سرِ راہ کسی سے نظر ملنا، ٹھٹکنا، جھجک جانا، نظر جھکا کے گزر جانا اور ؎

وہ اک نگاہ "اسے" دیکھتے چلے جانا

قسم کے مظاہرے بھی۔

کلف لگی وردیوں میں اکڑے اکڑے فوجیوں کی رفاقتیں اور فوجی بوٹوں کی چاپ سے گونجتے برآمدوں کو چھوڑ کر لہراتے آنچلوں اور نقرئی قہقہوں کے درمیان آبسنا یقیناً ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ لیکن جی ایچ کیو کی طرف سے

لبد مئی دیدہ و دامن تر مکن ہوشیار باش

قسم کی ہدایات وقتاً فوقتاً وصول ہوتی رہتی ہیں۔ فوجی حضرات ویسے بھی پڑھائی کا خیال رکھتے ہیں کہ فیل ہونے کی صورت میں ان کے "تجزیاتی مطالعے" کے لیے انھیں سنٹروں یا جی ایچ کیو میں بآسانی طلب کیا جا سکتا ہے۔ جو انسٹیٹیوٹ سے محض ایک ٹیلیفون کال کے فاصلے پر واقع ہیں۔ سویلین حضرات تاہم اپنے قیام کو طول دیتے رہتے ہیں جس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی ایک شعبے میں داخلہ لینے کے بعد کوئی امتحان پاس نہ کرنے کی قسم کھالی جائے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا بھر کی زبانیں سیکھنے کا بیڑہ اٹھایا جائے ہم نے ایک صاحب کو دیکھا کہ گذشتہ آٹھ سالوں سے انسٹیٹیوٹ کے طالب علم چلے آ رہے تھے۔ روسی، ترکی، اور انگریزی کے شعبوں سے فارغ ہو کر

شعبہ عربی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

انسٹیٹیوٹ میں چودہ زبانیں پڑھانے کا انتظام ہے شروع شروع میں ہر وہ زبان جسے ہم سمجھ نہ پاتے امیر خسرو کے حوالے سے ترکی ہی دکھائی پڑتی۔ لیکن آہستہ آہستہ واقفیت بڑھی اور تعارف کا سلسلہ وسیع ہوا تو معلوم ہوا کہ انسٹیٹیوٹ تو بڑے بڑے بھاری علماء پر مشتمل ہے۔

شعبہ فارسی کی سربراہ ڈاکٹر صغریٰ بانو نہ صرف خود ڈاکٹر ہیں بلکہ ان کے سٹاف میں مزید تین ڈاکٹر موجود ہیں زبان کی لطافت اور اخلاق کا سبھاؤ کوئی ان سے سیکھے۔

شعبہ اردو کے سربراہ ہیں جناب محمد آفتاب ثاقب۔ دھیمے دھیمے مزاج کی مسکراتی ہوئی شخصیت۔ ان کے طلبہ کی اکثریت غیر ملکیوں پر مشتمل ہوتی ہے جو دو ڈھائی سال میں مترجم بن کر اپنے ملکوں کو لوٹ جاتے ہیں یا پاکستان میں اپنے سفارت خانوں میں سرکاری فرائض انجام دیتے ہیں۔

سب سے زیادہ ہجوم شعبہ انگریزی میں پایا جاتا ہے۔ یہاں نہ صرف اپنے وطن کے طلبہ انگریزی پڑھتے ہیں بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی بہت سے لوگ جو انگریزی میں کورے ہیں یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پورے انسٹیٹیوٹ میں جتنی بھی زبانیں پڑھائی جاتی ہیں وہ انگریزی کے بگاڑ کا سبب بنتی رہتی ہیں۔ مثلاً عربی میں فعل پہلے لایا جاتا ہے جبکہ انگریزی میں یہ فاعل کے بعد لایا جاتا ہے۔ عربی میں تو فاعل اکثر فعل کے اندر ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کے ذکر کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ یہی حال دوسری زبانوں کا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ڈیڑھ دو سال کے بعد متعلقہ زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے بعد طلبہ کی انگریزی میں کافی "مجب" پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ انٹرپریٹر شپ کی سطح پر آتے ہی انھیں اور رہالنگ اور ڈسٹنگ کے لیے روزانہ شعبہ انگریزی میں بھیجا جاتا ہے جہاں کے سربراہ کرنل (ریٹائرڈ) ایس اے قریشی یہ کام نہایت بیدردی سے انجام دیتے ہیں۔ حاضری میں باقاعدگی اور ہوم ورک میں زیادتی طلبہ میں ناراضگی کا سبب تو بنتی ہے لیکن قہر درویش بر جانِ درویش۔ کرنل قریشی کام کے معاملے میں کسی لچک کے قائل نہیں۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

وہ اپنے سٹاف کی گوشمالی بھی کرتے رہتے ہیں اور ان کا قہر شفقتوں کی پھوار سمجھ کر یوں بھی سہنا پڑتا کہ ایک تو علم کا مرتبہ ویسے ہی بہت بلند ہے دوسرے اسٹاف میں خود انکی تربیت یافتہ طالبات شامل ہیں احتجاج کریں تو کیونکر؟

فرانسیسی زبان کے سربراہ ڈاکٹر لئیق بابری ہیں۔ وہ پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے وطن میں فرانسیسی پڑھانی شروع کی، کیریر کا آغاز گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا تھا۔ انگریزی لباس پہن کر، تب وہ بہت خوش پوش کہلایا کرتے تھے۔ خاص اسٹائل سے پائپ پیا کرتے اور انگریزی اور فرانسیسی میں شاعری۔

وہ فرانس گئے تو دیکھا وہاں ہر کوئی فرانسیسی قومیت کی بات کرتا ہے۔ فرانسیسی میں انگریزی کے کافی لفظ سرایت کر گئے ہیں ان کے ایک استاد نے اس بات پر جھنجھلا کر ایک کتاب لکھ ماری۔ جس میں ایسے غیر ملکیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں دیس نکالا دینے پر زور دیا گیا ڈاکٹر صاحب نے سوچنا شروع کیا کہ یہ تو غیر ملکی لفظوں پر لڑتے ہیں اور میں سراپا غیر ملکی ہوں۔ میرا لباس ملکی نہ زبان۔ تب ان کی کایا پلٹنی شروع ہوئے۔ واپس آئے تو کالج میں فرانسیسی پڑھا کر لب بِٹرک گئے کا رس پیا کرتے اور خوش ہوتے۔ طلبہ کو تلقین کیا کرتے کہ "کوکا کولا" چھوڑ کر "لسی" پیا کرو۔ پہلے خود فرانسیسی رنگ میں رنگے تھے آج کل فرانسیسیوں کو پاکستانی بنانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ فرانسیسی چھوڑ پنجابی میں شاعری شروع کر رکھی ہے۔ ایک مجموعہ "گھگو گھوڑے" کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے آج کل پنجابی کے صوفی شعراء کا کلام فرانسیسی میں منتقل کر رہے ہیں۔ مغربیت میں رچے بسے اونچے گھرانوں کے جو چشم و چراغ یہاں آتے ہیں، زبان کے ساتھ ساتھ انھیں پاکستانیت نہ صرف پڑھاتے ہیں بلکہ سکھاتے بھی ہیں۔

ہمیں عربی پڑھانے والوں میں اکثریت مصری اساتذہ کی تھی۔ جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل یہ لوگ سرتاپا خلوص تھے۔ استاذ عبداللطیف نکلتے ہوئے قد کی طویل شخصیت، عربی کی بات ہو تو علم کا خزینہ، شوخیوں کا دور ہو تو دمکتا نگینہ، دنیا بھر کے لطیفے نوکِ زبان۔ موضوع کچھ بھی ہو وہ محفل کی جان۔ ہمیں گرامر پڑھایا کرتے، جس کی ساری یبوست ان کے انداز بیان

میں بہہ گئی۔ یادوں کی حویلی میں مستحکم تو امدرہ گئے یا ان کا شگفتہ چہرہ۔

استاذ سرحان جوہر سرحان فصیح اللسان خطیب، شعلہ نوا شاعر، قرآن پڑھتے تو یوں لگتا جیسے ابھی آسمان سے نازل ہو رہا ہو سامعین کو سکتہ ہو جاتا غصے میں آتے، تو کلاس میں زلزلے کا ارتعاش پھیل جاتا۔ پگھلنے لگتے تو یَا وَلَدِیْ یَا بُنَیَّ (اے بیٹے، اے بچے) کہتے کہتے زبان سوکھتی۔

استاذ الکومی۔ ایک منحنی سا نوجوان۔ شرم وحیا میں لڑکیوں کو مات کرتے عرب ملکوں کے اخبارات پڑھاتے تو ہماری ضد ہوتی کہ "ضرورتِ رشتہ" کے اشتہارات سمجھائیں کیا لکھا ہے ان میں۔ ان کا زور ہمیشہ دینی کالموں پر ہوتا یا عالمی خبروں پر۔

شام کے ایک استاد تھے جو یہ ثابت کرنے پر تلے رہتے تھے کہ اشتراکیت قرآن سے ثابت ہے۔ جس کے جواب میں انھیں طرح طرح کی صلواتیں سننے کو ملتیں کچھ طلبہ کا کہنا تھا کہ اس طرح تو یہودیت بھی قرآن سے ثابت ہے۔ اور فلسطین پر ان کا قبضہ بھی برحق کہ حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں وہ چالیس برس یہاں گشت نوردی کرتے رہے۔ اب دو چار بستیاں بسالیں تو کیا ہوا۔

پاکستانی اساتذہ میں ایک تو شعبے کے سربراہ تھے ڈاکٹر میر ولی خان جنھیں ہر دوسرے تیسرے ہفتے کتابیں بدلوانے کا شوق تھا ہر ہفتے وہ یہ کہتے کہ کلاس کا معیار اونچا ہوگیا ہے کوئی بہتر کتاب پڑھنی چاہیے۔ چنانچہ کوئی نئی کتاب شروع کر دی جاتی بعد میں انھوں نے ہمیں اخبارات سے ترجمہ کرنے کا سلسلہ شروع کروایا جس نے عرب صحافت کو سمجھنے میں ہماری بہت مدد کی۔

استاد ضیاء الحق، کام سے کام رکھتے مجال ہے جو ان کے پیریڈ میں ایک منٹ بھی ضائع ہو جائے۔ عربی سمجھنے میں ان کے لیکچروں نے بنیادی پتھروں کا کام دیا۔ ابھی ہم بیروں پر کھڑا ہونا سیکھ رہے تھے کہ حکومت نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ روانہ کر دیا بڑے متقی آدمی ہیں۔ پُرشور دریا کی تند و تیز موجوں میں کھڑا رہ کر دامن بچانا جانتے ہیں۔ یکندن بن کر لوٹیں گے۔

لوٹے تو استاد جمیل قلندر بھی ہیں لبنان سے۔ لیکن خود کو جانے گردی رکھ آئے ہر وقت کھوئے کھوئے، خیالوں میں گم۔ فارسی بولتے روانی کے ساتھ پشتو اور عربی کے شاعر ہیں۔ عربی شاعری کا ایک دیوان بیروت میں زیرِ طبع تھا جانے کیا ہوا وہاں تو زندگی لہولہو ہے نوائے زندگی کیوں کر سنائی دے۔

ایک خاتون بھی پڑھاتی تھیں ہمیں مس عفت۔ خلیجی ممالک میں رہ کر آئی تھیں اس لیے عربی روانی سے بولتی تھیں۔ کبھی کبھی لہجے میں تیزی آجاتی تو یوں لگتا کوئی پنجابن اپنی پڑوسن سے لڑ رہی ہے۔ ویسے عام طور پر پرسکون رہتی ہیں۔ عرب خواتین کا کوئی وفد پاکستان آئے تو مترجم کے طور پر انھی کی خدمات طلب کی جاتی ہیں۔ ٹیلیویژن کے عربی پروگرام پر بھی آتی رہیں کافی دنوں۔

ہم انسٹیٹیوٹ میں وارد ہوئے تو ماحول خاصا خوشگوار تھا لیکن بریگیڈیر محمد سعید کھوکھر کے ہاتھوں ساری خوشگواریاں رخصت ہوگئیں موصوف اچھے بھلے ملٹری کالج جہلم کے کمانڈنٹ تھے۔ اور بڑے کامیاب منتظم لیکن ادھر اسلام آباد میں فیصلہ ہوا کہ انسٹیٹیوٹ کو فوج کے حوالے کر دیا جائے۔ ادھر بریگیڈیر سعید کھوکھر کو ڈائرکٹر بنا کر انسٹیٹیوٹ پر مسلط کر دیا گیا۔ کہتے ہیں نام کا شخصیت پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ بریگیڈیر سعید کھوکھر کے نام کے پہلے حصے پر غور کریں جوان کا اصلی نام دکھائی پڑتا ہے تو کسی سعید روح کا گمان گذرتا ہے، تاہم دوسرے حصے کا تلفظ سماعت پر گراں گذرتا ہے۔ خیال تھا کہ وہ اپنے حسن سلوک سے یہ کمی پوری کریں گے۔ لیکن تجربات سے ثابت ہوا کہ بندہ پکا فوجی ہے۔ نفاستوں کا طالب نہ نزاکتوں کا تمنائی۔ زبانوں کے ایک بہترین ادارے کا سربراہ ہونے کے باوجود انھیں لفظوں کے کھیل پسند نہیں تھے۔ بنیادی طور پر ریاضیات کے ماہر ہیں چنانچہ دو جمع دو چار کے قائل۔ اس پر مستزاد یہ کہ سروس کا زیادہ تر حصہ پی ایم اے میں گذارا، یا ملٹری کالج جہلم میں جہاں زندگی سراپا ڈسپلن ہے انسٹیٹیوٹ میں زندگی خوبصورتیوں کا نام تھی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

فضاؤں میں بے باک قہقہے اڑتے پھرتے برآمدوں میں خوشبوئیں، کینٹین آباد رہتی اور ہرا بھرا لان شاداب۔ بریگیڈیر سعید کھوکھر کیا آئے انسٹیٹیوٹ سے ساری "رومانیت" رخصت ہوگئی۔ پی ایم اے اور ملٹری کالج کا سارا ڈسپلن انھوں نے پورے زور وشور سے انسٹیٹیوٹ میں نافذ کرنا شروع کر دیا۔

"پیریڈ کے دوران میں کوئی طالب علم کلاس سے باہر نظر نہ آئے"، طلبہ کو حکم۔

"طلبہ کو زیادہ سے زیادہ کام دیا جائے گا اور کاپیاں باقاعدہ چیک کی جائیں گی"، اساتذہ کو ہدایت۔

"استاد موجود نہ ہوں تو طلبہ کلاس روم ہی میں ٹھہریں گے اور کورس کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے"، نئے ضابطے کا اجراء

"فوجی طلبہ یونیفارم پہن کر آئیں گے۔ ڈائریکٹر کی اجازت کے بغیر کوئی شخص انسٹیٹیوٹ سے دائیں بائیں نہیں ہوگا"

فوجی طلبہ پر ایک اور ستم۔

بات صرف ہدایات جاری کرنے تک محدود رہتی تو شاید یار لوگ محفلیں اجڑنے نہ دیتے۔ کہ بھلا ضابطوں کے اجراء نے بھی کبھی زندگی میں ضبط پیدا کیا ہے لیکن بریگیڈیر کھوکھر ایک ہی کائیاں نکلے۔ وہ ہاتھ میں سٹک اٹھائے پورے انسٹیٹیوٹ کا راؤنڈ کرتے پھرتے کوئی طالب علم کلاس سے باہر نظر آجاتا تو عین موقع پر "تحقیقاتی کارروائی" کا آغاز ہو جاتا۔ بال کی کھال نکالی جاتی اور اس سلسلے میں صنفِ نازک کی کوئی نزاکت کسی کام نہ آتی۔ چند دنوں ہی میں اتنی "دہشت" پھیل گئی کہ پیریڈ کے دوران میں کینٹین اجڑی نظر آتی۔ برآمدے سنسان، ایسے میں کوئی باہر سے آتا تو شک گذرتا کہ شاید بغداد کی افسانوی گلیوں میں آنکلا۔ کہ جہاں شہر کی ساری خوبصورتیاں تو موجود ہوتیں لیکن زندگی ندارد۔

منچلے طلبہ ان پابندیوں کے باوجود مل بیٹھنے کی کوئی نہ کوئی سبیل ڈھونڈھ نکالتے کبھی کہیں پکنک پر چلے جاتے کبھی کوئی دستاویزی فلم اٹھا لاتے اور ادارے کے ڈائرکٹر کو

مہمانِ خصوصی بنا کر ڈنکے کی چوٹ فلم دیکھتے۔

ایک مرتبہ فرانسیسی اور جرمنی کے شعبوں میں ہاکی میچ ہونا طے پایا۔ غیر جانبداری کی خاطر ریفری کسی اور شعبے سے لینا قرار پایا۔ قرعہ فال ہمارے نام پڑا۔ فرانسیسی شعبے میں ہماری اچھے لوگوں سے دوستیاں قائم تھیں۔ لیکن انھیں نظر انداز کر دیا گیا ایک شام آرمی سٹیڈیم راولپنڈی میں میچ شروع ہوا۔ تو دونوں شعبوں کی ٹیموں کے علاوہ طلبہ و طالبات کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ ہاف ٹائم تک فرانسیسی شعبہ ہار رہا تھا۔ وقفے میں ان کا ایک وفد ہمارے پاس آیا۔ اور دوستیوں کے حوالے سے "کچھ" کرنے کو کہا۔ ہم مذاق میں کہہ بیٹھے کہ بھئی اپنے کھلاڑیوں کو کہو کہ وہ فریق مخالف کی ڈی میں تو داخل ہوں ہاف لائن پر تو ہم پنلٹی کارنر یا پنلٹی سٹروک دینے سے رہے۔ گرچہ ہم نے یہ بات انتہائی "غیر جانبداری" سے کی تھی۔ لیکن "جرمنوں" نے سن لی۔ انھوں نے وہ شور مچایا کہ الاماں مجبوری یہ تھی کہ کوئی اور ریفری میسر نہیں تھا چنانچہ بادلِ نخواستہ ہماری ہی زیر نگرانی میچ دوبارہ شروع ہوا۔ لیکن پھر ہوتا یہی رہا کہ ہم فرانسیسیوں کے حق میں صحیح فیصلہ بھی دیتے تو گیلری سے مترنم قسم کے احتجاجی نعرے سنائی دیتے۔

"ریفری جانبدار"، "ریفری ہائے ہائے"۔

جرمنوں کے حق میں کوئی فیصلہ دیتے تو مخالف گیلری سے صدائیں آتیں

"ریفری جوان بنو"۔ "ہٹلروں سے مت ڈرو"۔

فرانسیسی شعبے نے بری طرح شکست کھائی بقول جرمنوں کے

"ہماری تمام تر جانبداری کے باوجود"۔

بعد میں جب ایک صحافی نما حضرت نے ہمارا انٹرویو لیتے ہوئے کھیل کے بارے میں تاثرات پوچھے تو ہم نے یہی کہا

"آج تاریخ نے خود کو کھیل کے میدان میں دہرایا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے پہلے مرحلے میں ہٹلر نے فرانس کو اسی طرح تاخت وتاراج کیا تھا لیکن آخری فتح فرانس ہی کی ہوئی تھی"۔

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

فرانسیسی شعبے سے ہمیں داد ملی، جرمن شعبے سے گالیاں لیکن ہم بدمزہ نہ ہوئے کہ کچھ لوگوں کے غصّے پر پیار آتا ہے۔ ویسے بھی کھیل کی شوخیوں میں سنجیدگی سے ناراض ہونا یا دل چھوڑ بیٹھنا پرلے درجے کی حماقت ہے یا انتہائی درجے کا کفر۔ حالات چاہے کتنے ہی سوگوار کیوں نہ ہوں۔

ویسے انسٹیٹیوٹ میں ہمیں ایک بارا چھلے بھلے سوگوار تجربے سے گذرنا پڑا۔ پہلے سال کی موسمِ گرما کی تعطیلات کا ذکر ہے۔ راولپنڈی میں ہمارے ایک ہم نام کیپٹن ٹریفک کے ایک حادثے میں اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔ شعبہ صحافت میں یہ خبر ہمارے کسی سرسری جاننے والے کے ہاتھ لگ گئی۔ انھوں نے محض نام دیکھ کر ہی فرض کر لیا، کہ فوج میں ایک ہم ہی کیپٹن اشفاق ہیں۔ انھوں نے ایک دو سطریں اور بڑھا دیں، کہ مرحوم کو ادب سے لگاؤ تھا ایک کتاب کے مصنف بھی تھے وغیرہ وغیرہ۔ گویا خبر ہم پر پوری طرح منطبق کر دی۔ یہ خبر راولپنڈی کے ایک اخبار میں چھپی ہم ان دنوں موسم گرما کی تعطیلات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فلائنگ کی ابتدائی تربیت گلائیڈنگ (GLIDING) سیکھنے کوئٹہ گئے ہوئے تھے۔ اس لیے اس خبر کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ ورنہ اپنے انتقال پر ملال کی تردید چھپوا لیتے۔ لیکن ہوا یوں کہ چھٹیوں کے بعد انسٹیٹیوٹ آئے تو پہلے دن ہر شخص ہمیں عجیب عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔ شعبے کی لائبریری میں داخل ہوئے، تو لائبریرین چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا پوچھا:۔

"آپ زندہ ہیں؟"

ہماری ٹیچر مس عفت بھی موجود تھیں یہ موٹے موٹے آنسو صاف کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ وہ تو کئی پارے پڑھ کر ہماری روح کو ایصالِ ثواب بھی پہنچا چکی ہیں نہ ہے نصیب۔ پتہ چلا شعبہ فارسی میں تو قرآن خوانی کا باقاعدہ پروگرام زیر غور ہے ہم نے بڑا اصرار کیا کہ یہ محفل تو ہو ہی جائے۔ ہم خود بھی اس میں شریک ہوں گے لیکن پھر شرط یہی ٹھہری کہ اس کے لیے سچ مچ مرنا ہوگا وہ جو:۔

روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں   جب تیرے شہر سے گذرتا ہوں

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

والی بات مسترد کر دی گئی۔

تو صاحبو! اسی طرح کے بلبلے بنتے رہے، مٹتے رہے، وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔ پرخلوص اساتذہ اور بہت سے خوبصورت ساتھیوں کی معیت میں ڈھائی سال کا عرصہ پلک جھپکتے پانی کی طرح بہہ گیا۔ وہ کلاس جو شروع میں چالیس سے زائد افراد پر مشتمل تھی سکڑ کر چند طلبہ تک محدود رہ گئی۔ جن میں اوّل آنے پر ہمیں خوشی ہوئی، نہ سکھ کہ جب تک رزلٹ آیا ہم ملٹری کالج جہلم میں کیڈٹوں کو عربی اور انگریزی پڑھانے پر مامور تھے۔ ساتھی بچھڑ گئے تھے۔ مالا ٹوٹ گئی تھی۔ موتی بکھر گئے تھے۔ جانے کون موتی کہاں دمک رہا ہوگا۔

یہ بستی کیسی بستی ہے؟

یہ بستی کیسی بستی ہے ہر ملک کی اِس میں ہستی ہے
غم و اَلم کا نام نہیں ہے، خُوش خُوش ہر اِک ہستی ہے

چینی بھی موجُود یہاں پر، رُوسی بھی ہیں جرمن بھی
پھر بھی اِس بستی میں لوگو چین کی بنسی بجتی ہے
کیسی یہ بستی ہے لوگو کیوں کر ایسی بستی ہے
غم و اَلم کا نام نہیں ہے خُوش خُوش ہر اِک ہستی ہے

ہر مُلک کی ہے تہذیب الگ ہر مُلک کا ہے انداز جُدا
یاں صُبح سویرے ملنے کا ہر شخص کا ہے انداز جُدا
کوئی آنکھوں میں جذبات کا اِک طوفان لیے شرماتا ہے
کوئی دردِ دِل سینے میں لیے کچھ سوچتا ہے گھبراتا ہے
کچھ لوگ کہیں خوش آئی، خوش آمدنت آبادی ما
بونژو موشیو کچھ کہتے ہیں، کچھ کہتے ہیں آداب میاں
گوٹن ٹاک کہیں جرمن، عربی ہیں کہیں اھلاً سھلاً
ٹرکش بولیں گناتے دِن اور کچھ پوچھتے ہیں کیسے ہو میاں

۱ فرانسیسی

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کوئی دُور سے پھینکے گڈ مارننگ کوئی پاس آکے بس ہنستی ہے
یہ بستی کیسی بستی ہے، ہر ملک کی اِس میں ہستی ہے

یاں شکر کے ہیں الفاظ الگ، انداز الگ، آداب الگ
کوئی جُھک جُھک کر یُوں دُہرا ہو کہ لگے ہے سب سے الگ تھلگ
کچھ زیرِ لب مرسی بوکو، کچھ ڈانکے شیون، کچھ شیاشیا
جیسے کوئی ہولے ہولے اپنوں کو پکارے پیا! پیا!
بفرما تید کی گردانیں، عربی میں تفضّل کی تانیں
نی ہاؤ ما کو کوئی کیا جانے، پر دِل کی زبان کو سب جانیں
ترکی میں تشکر ایدے رم، اُردو میں سرِ تسلیم ہے خم
یہ لفظ ہیں اُن جذبوں کی زباں جو کم کر دیں انسان کا غم
کہتے ہیں جذبات کا گر اظہار ہو زحمت گھٹتی ہے
یہ بستی کیسی بستی ہے ہر ملک کی اِس میں ہستی ہے

کچھ کمیونزم کے رکھوالے، کچھ قومیت کے متوالے
ٹرکش یہ کہیں یورپ میں ہم مشرق کا بھرم رکھنے والے
کچھ مذہب کے ہیں دیوانے، کچھ شمعِ حُسن کے پروانے
کچھ رنگ برنگی کلیاں ہیں، کچھ بھنورے ہیں کچھ دیوانے
ہیں دیس دیس کے رنگ یہاں اور دیس بدیس کے پروانے
اِن دیس بدیس کے رنگوں سے یہ محفل اور بھی سجتی ہے
یہ بستی کیسی بستی ہے ہر ملک کی اِس میں ہستی ہے

۲ فرانسیسی ۳ جرمن ۴ چینی ۵ فارسی ۶ چینی۔ (آپ کیسے ہیں؟)

کوئی ای۔ایم۔ای کا میجر ہے کوئی کیپٹن ہے سپلائی کا
کوئی صاحب ایجوکیشن کا کوئی لڑکا ہیسہ ودھائی کا
کچھ آرٹلری کے افسر ہیں کچھ ایف ایف آر کے شہزادے
کچھ نیوی کے سیلرز ہیں یہاں کچھ پاک فضائیہ کے بانکے
ہیں بھانت بھانت کے لوگ یہاں اور شہر شہر کے باشندے
کچھ لڑکیاں ہیں پنجاب کی تو کچھ کوہستان کے پاوندے
کچھ نازک نام سحر جیسے شمع جیسے افشاں جیسے
کچھ روشن نام چمکتے ہیں مہتاب ہو ضوافشاں جیسے
کچھ نازک نازک سے پاؤں جو فرشِ گل پہ زخمی ہوں
کلیاں راہوں میں بکھری ہوں تو کلیاں جن کو چبھتی ہوں
اِن نازک نازک چہروں میں کچھ چہرے ایسے چہرے ہیں
مجنوں کے لگیں جو پرداد ے جو ہیئر کٹ چاچے کھیڑے ہیں
کچھ خود کو کہتے ہیں فرہاد، وحشت سے بال بکھیرے ہیں
کوئی جیمز بانڈ کے ہمسائے کچھ ہیڈلے چیز کے چیلے ہیں
کوئی مجنوں ہے کوئی رانجھا ہے کوئی پاٹے خان کا سالا ہے
کوئی ہیرو ہے کوئی وِلن ہے کوئی آفت کا پرکالا ہے
اِن چہروں کو میں دیکھوں تو میری وحشت اور بھی بڑھتی ہے
یہ بستی کیسی بستی ہے ہر ملک کی اِس میں ہستی ہے

پنڈ دادن خان سے اِک لڑکی، فرانسیسی پڑھنے آئی ہے
ماں باپ کی ہے وہ لاڈلی اور اکلوتا اُس کا بھائی ہے
اب بال کٹا کے فیشن کے اِک ناز سے چلتی پھرتی ہے

کبھی جین پہن کر آتی ہے کبھی لمبی سی اِک کُرتی ہے
پنجابی اُس کو بھُول گئی، اُردُو سے وہ شرماتی ہے
انگریزی بولے فرفر، فرانسیسی بھی کچھ آتی ہے
بالوں کی لٹیں چہرے پہ لیے وُہ اکثر یہ فرماتی ہے

but I was born here by fault.
But now I shall go to Paris and never return here at all

میں اِس لڑکی کو دیکھتا ہُوں کہ رُوپ یہ کیسے بھرتی ہے
کبھی چھوڑتی ہے بالوں کو کھُلا کبھی جُوڑا باندھ کے رکھتی ہے
یہ بستی کیسی بستی ہے ہر مُلک کی اِس میں ہستی ہے

کچھ دوشیزائیں ایسی ہیں جو شرم و حیا کی پیکر ہیں
اِن کے جسموں پر جیکٹ ہیں نہ بکنی ہیں نہ نیکر ہیں
وہ لان میں بیٹھ کے چلّائیں نہ چلتے چلتے اِترائیں
وہ بات کریں تو پھُول جھڑیں اور حُسن میں چاند کو شرمائیں
اِن کے ہونٹوں پہ سُرخی ہے نہ گالوں پر کوئی غازہ ہے
بس اِک سادہ سی چادر ہے یا لمبا ایک عُبادہ ہے
چادر میں لپٹی لپٹائی اِک آن سے آتی جاتی ہیں
سچ بات تو یہ ہے چادر میں ہر لڑکی اور بھی سجتی ہے
یہ بستی کیسی بستی ہے ہر مُلک کی اِس میں ہستی ہے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com

کچھ لڑکیاں ایسی لڑکیاں ہیں اِک ناز سے جو اِتراتی ہیں
جیسے گلشن میں تیتریاں جو پھولوں پہ منڈلاتی ہیں
بس ہر دم اُڑتی پھرتی ہیں، بلبل کی طرح چہکتی ہیں
کبھی اس لڑکے کو چھیڑتی ہیں کبھی اُس کو دیکھ کر ہنستی ہیں
اِن کی اِس آنکھ مچولی کی یہ تان کبھی تو ٹوٹے گی!
جانے کس کے پلّے پڑیں گی، کِس کی قسمت پھوٹے گی!
فِی الحال تو اِن میں سے ہر لڑکی بِلا وجہ ہی ہنستی ہے
یہ بستی کیسی بستی ہے ہر ملک کی اِس میں ہستی ہے

Scanned by iqbalmt@oneurdu.com